ماہنامہ

اشراق

لاہور

اگست ۲۰۱۸ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود وہ عملاً اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔“

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور
جلد ۳۰ شمارہ ۸ اگست ۲۰۱۸ء ذوالقعدہ/ ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فہرست

شذرات
قربانی — جاوید احمد غامدی — ۴
اسلام کا منشا جمہوریت یا آمریت — سید منظور الحسن — ۱۰
قرآنیات
البیان: الانبیاء ۲۱: ۱- ۳۳ (۱) — جاوید احمد غامدی — ۱۴
معارف نبوی
اسلام اور فطرت — جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس — ۲۵
سیر و سوانح
ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۸) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۰
مقالات
تعددِ معنی اور دلالتِ لسانی — ساجد حمید — ۳۶
احمدیت کی اشاعت اور بنیادی استدلالات کا مختصر جائزہ — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۸
اصلاح و دعوت
تذکیر بالقرآن — محمد ذکوان ندوی — ۸۰

فی شمارہ 30 روپے
سالانہ 300 روپے
رجسٹرڈ 700 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)
بیرون ملک
سالانہ 30 ڈالر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

جاوید احمد غامدی

قربانی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۴)

''ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کی عبادت مشروع کی ہے تاکہ اللہ نے جو مواشی جانور اُن کو بخشے ہیں، اُن پر وہ اللہ کا نام لیں، (کسی اور کا نہیں)۔ سو تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کرو (اور اُسی کے آگے جھکے رہو)، اور اُنھیں خوش خبری دو، (اے پیغمبر)، جن کے دل اُس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔''

دنیا کے تمام قدیم مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو موت کے لیے پیش کرنا ہے، لیکن غور کیجیے تو یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: 'وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ'[1] (اور جو لوگ اللہ کی اِس راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم اُس زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے)۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے کہ نماز جس طرح اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اِسی طرح قربانی اُس کی راہ

۱۔ البقرہ ۲:۱۵۴۔

میں ہماری موت ہے:

قُلْ: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (الانعام ۶:۱۶۲)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک عظیم قربانی کو اُس کی یادگار بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ'[۲] (ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اسمٰعیل کو چھڑا لیا)۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر،[۳] ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں[۴] اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اِس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اِسی حقیقت کی تصویر ہے۔ سیدنا ابراہیم اور اُن کے جلیل القدر فرزند نے جب اپنے آپ کو اِس کے لیے پیش کیا تو قرآن نے اِسے اسلام ہی سے تعبیر کیا ہے: 'فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ'[۵] (پھر جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا)۔ سورۂ حج کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اُس میں بھی دیکھ لیجیے، 'فَلَہٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ' کے الفاظ میں قرآن نے کس خوبی کے ساتھ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمھارے دل اگر اپنے معبود کے سامنے جھکے ہوئے ہیں تو اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر دو، اِس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ قربانی کی روح یہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ عبادت خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے، لہٰذا اِس میں کسی دوسرے کو اُس کا شریک نہ بناؤ۔

۲۔ الصافات ۳۷:۱۰۷۔

۳۔ بخاری، رقم ۵۵۶۵۔ مسلم، رقم ۵۰۹۰۔

۴۔ یعنی نحر کے لیے جانور کو کھڑا کر کے اور ذبح کی صورت میں قبلہ رو لٹا کر۔

۵۔ الصافات ۳۷:۱۰۳۔

قربانی کی تاریخ

قربانی کی تاریخ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی: 'اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ'[6]۔بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔ پیدایش میں ہے:

''اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اُس کے قائین پیدا ہوا۔تب اُس نے کہا: مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائین کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائین کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ اُن کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اُس کے ہدیے کو منظور کر لیا۔ پر قائین کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔'' (۴: ۱-۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہوگا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام قدیم مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو کر ہجرت کی تو اِس کے ساتھ ہی دعا فرمائی کہ پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ فرزند اسمٰعیل تھے۔قرآن کا بیان ہے کہ یہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ اُنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو رہی ہے کہ اِس بیٹے کو اپنے پروردگار کی خاطر قربان کر دیں۔ یہ ہدایت اگرچہ خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی باتیں تاویل و تعبیر کی محتاج ہوتی ہیں، چنانچہ اِس خواب کی تعبیر بھی یہی تھی کہ وہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں۔ اِس سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ وہ فی الواقع اُسے ذبح کریں۔لیکن خدا کے اِس صداقت شعار بندے نے کوئی تعبیر نکالنے کے بجاے من و عن اِس کی تعمیل کا فیصلہ کر لیا اور اِس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے اپنا خواب اُسے بتایا۔سیدنا اسمٰعیل نے اِس خواب کو خدا کا حکم سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ ابا جان، آپ بے دریغ اِس کی تعمیل کریں۔ان شاء اللہ، آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔ بچے کے جواب سے مطمئن ہو کر ابراہیم اُس کو مروہ کی پہاڑی کے پاس لے گئے اور قربانی کے لیے پیشانی کے بل لٹا دیا۔

۶؎ المائدہ ۵: ۲۷۔

قریب تھا کہ چھری چل جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی: ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ ایک بڑی آزمایش تھی، تم اِس میں کامیاب ہوئے، لہٰذا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ابراہیم کے اِس فرزند جلیل کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی قربانی کے عوض چھڑا لیا اور اِس واقعے کی یادگار کے طور پر ہر سال اِسی تاریخ کو قربانی کی ایک عظیم روایت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی۔ یہی قربانی ہے جو حج وعمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

قَالُوا: ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا، فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ. وَقَالَ: اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ. رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ. فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ، قَالَ: يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى؟ قَالَ: يٰٓاَبَتِ، افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ، اِنْ شَآءَ اللّٰهُ، مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ.
(الصافات ۳۷: ۹۷-۱۰۷)

''اُنھوں نے کہا: (اِس کا یہی رویہ ہے تو) اِس کے لیے ایک عمارت کھڑی کرو، پھر اِس کو دہکتی آگ میں پھینک دو۔ سو اُنھوں نے اُس کے ساتھ چال کرنی چاہی تو ہم نے اُنھی کو نیچا دکھا دیا۔ ابراہیم نے کہا: (تم لوگوں کو چھوڑ کر اب) میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔ پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ (ابراہیم نے یہ دعا کی) تو (اِس کے جواب میں) ہم نے اُس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ (وہ لڑکا جوان ہوا)، پھر جب وہ اُس کے ساتھ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچا تو ابراہیم نے (ایک دن) اُس سے کہا: میرے بیٹے، میں (کچھ دنوں سے) خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تو غور کرو، تمھاری کیا راے ہے؟ اُس نے کہا: ابا جان، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے، اُس کی تعمیل کیجیے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے اُس سے پکار کر کہا کہ ابراہیم، تم نے خواب کو سچا کر دکھایا ہے تو تصور کرو کہ دریاے رحمت نے کیسا جوش مارا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ خوبی سے عمل کرنے والوں کو ہم ایسی ہی جزا دیتے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہیں۔ یقیناً یہ کھلی آزمایش تھی۔ (ابراہیم اِس میں کامیاب ہو گیا تو) ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اسمٰعیل کو چھڑا لیا۔''

قربانی کا مقصد

قربانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام واخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے یہ مقصد اِس طرح واضح فرمایا ہے:

لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمۡ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ، وَبَشِّرِ الۡمُحۡسِنِيۡنَ. (الحج ۲۲: ۳۷)

''اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اِسی طرح اللہ نے اُن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور، (اے پیغمبر)، اُن لوگوں کو بشارت دو جو خوبی کا رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔''

قربانی کا قانون

قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواترِ عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰/ ذوالحجہ کو عیدالاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ سورۂ حج کی آیات میں 'اَيَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ' سے یہی مراد ہیں[7]۔ اصطلاح میں اِنھیں 'ایام تشریق' کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے

---

[7] ۲۲: ۲۸۔ ''اور چند متعین دنوں میں اُن مواشی جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنھیں بخشے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے، اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ 'فَکُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَالۡمُعۡتَرَّ'[8] کے الفاظ میں قرآن نے اِس کی صراحت کر دی ہے۔

قربانی کا قانون یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، البتہ اِس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت فرمائی ہے:

اول یہ کہ قربانی کے مہینے میں قربانی کرنے والے نذر کی قدیم روایت کے مطابق قربانی سے پہلے نہ اپنے ناخن کاٹیں گے اور نہ بال کتروائیں گے۔[9]

دوم یہ کہ قربانی ہر حال میں عید کی نماز کے بعد کی جائے گی۔ یہ اگر پہلے کر لی گئی ہے تو محض ذبیحہ ہے، اِسے عیدالاضحیٰ کی قربانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔[10]

سوم یہ کہ قربانی کے لیے اچھی عمر یہ ہے کہ بکری کا بچہ کم سے کم ایک سال، گائے بیل دو سال اور اونٹ یا اونٹنی کم سے کم پانچ سال کی ہونی چاہیے۔ یہ میسر نہ ہوں تو مینڈھا ذبح کر لیا جائے۔ یہ اگر چھ ماہ کا بھی ہو تو کفایت کرے گا۔[11]

چہارم یہ کہ گائے بیل اور اونٹ یا اونٹنی کی قربانی میں ایک سے زیادہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ شرکا اگر سات بھی ہوں تو مضایقہ نہیں ہے۔[12] بلکہ روایتوں میں آیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک موقع پر دس افراد شریک ہوئے تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔[13]

پنجم یہ کہ قربانی ایک نفل عبادت کے طور پر عیدالاضحیٰ کے علاوہ بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ بچوں کی پیدایش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قربانی کی اور دوسروں کو بھی اِس کی ترغیب دی ہے۔[14]

۸؎ الحج ۲۲: ۳۶۔ ''تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو (محتاج ہیں، مگر) قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آ جائیں۔''

۹؎ مسلم، رقم ۵۱۲۱۔

۱۰؎ بخاری، رقم ۵۵۶۰، ۵۵۶۱، ۵۵۶۲۔ مسلم، رقم ۵۰۶۴، ۵۰۶۹، ۵۰۷۹۔

۱۱؎ مسلم، رقم ۵۰۸۲۔ ابوداؤد، رقم ۲۷۹۹۔ نسائی، رقم ۴۳۸۳۔

۱۲؎ مسلم، رقم ۳۱۸۶۔

۱۳؎ ترمذی، رقم ۱۵۰۱۔ نسائی، رقم ۴۳۹۷، ۴۳۹۸۔

۱۴؎ بخاری، رقم ۵۴۷۲۔ ابوداؤد، رقم ۲۸۴۱۔

سید منظور الحسن

اسلام کا منشا جمہوریت یا آمریت

جمہوریت اور آمریت میں سے اسلام کس طرز حکومت کی تائید کرتا ہے؟ یہ سوال ہمارے ہاں اکثر زیر بحث رہتا ہے۔ اِس معاملے میں تبادلۂ خیال کا دائرہ بالعموم یک طرفہ ہوتا ہے۔ یہ گفتگو تو کی جاتی ہے کہ جمہوریت کے فلاں فلاں مظاہر اسلام کے منافی ہیں، مگر اِس پر بحث سے گریز کیا جاتا ہے کہ آمریت کے کون کون سے پہلو اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ گریز بجاے خود اِس بات کی دلیل ہے کہ قائلین کا ضمیر اِس کی اجازت نہیں دیتا کہ آمریت کو اسلام کی نسبت سے بیان کریں یا اُس کے لیے قرآن وسنت سے استدلال پیش کریں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسلمانوں کا نظم سیاسی جمہوری ہے یا غیر جمہوری، اِس معاملے میں قرآن مجید نے اپنا موقف پوری وضاحت کے ساتھ سورۂ شوریٰ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ. (۳۸:۴۲) ’’اور اُن کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔‘‘

یہ قرآن مجید کی صریح نص ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے تمام معاملات اُن کے آپس کے مشورے سے طے ہوں گے۔ حکومت اُن کی راے سے قائم ہوگی اور اُن کی راے سے ختم ہوگی۔ نظم ونسق اُن کے مشورے سے تشکیل پائے گا اور مشورے سے تبدیل ہوگا۔ آئین اور قانون سازی میں اُنھی کی راے فیصلہ کن ہوگی۔ آیت کے اسلوب سے واضح ہے کہ یہ مشورے کے اختیار یا لزوم کو بیان نہیں کر رہی، بلکہ اُس کو اساس بنا رہی ہے۔ لہٰذا اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مشاورت ایک بہتر حکمت عملی ہے جس کا حکمرانوں کو اہتمام کرنا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام منحصر ہی اُن کی مشاورت پر ہے۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے اِس آیت کے

حوالے سے بیان کیا ہے کہ اسلام کے قانون سیاست میں نظم حکومت کی اساس یہی تین لفظوں کا جملہ ہے جو اپنے اندر جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے۔ اِس کا اسلوب آل عمران (۳) کی آیت ۱۵۹ سے مختلف ہے جہاں 'شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ' (نظم اجتماعی کے معاملے میں اُن سے مشورہ لیتے رہو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں اِس کے بجائے 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کا اسلوب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی نظام کی عمارت مشورے ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اُن کے نزدیک اسلوب بیان کی اِس تبدیلی کا تقاضا ہے کہ:

''امیر کی امارت مشورے کے ذریعے سے منعقد ہو۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ جو کچھ مشورے سے بنے، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ لیا جائے، ہر شخص کی راے اُس کے وجود کا جز بنے۔ اجماع واتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی راے قبول کر لی جائے۔'' (میزان ۴۹۳)

ہمارے مفسرین نے بھی اِس آیت کو سیاست کے بنیادی اصول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اِس کی بنا پر اُنھوں نے جہاں آمریت کو اسلام کے منافی قرار دیا ہے، وہاں یہ تسلیم کیا ہے کہ دور جدید کی جمہوریت میں اِسی اصول کی روح کارفرما ہے۔ صاحب ''معارف القرآن'' مفتی محمد شفیع عثمانی بیان کرتے ہیں کہ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کے اصول نے شخصی بادشاہت اور وراثتی حکومت کے غیر فطری تصورات کی بیخ کنی کی ہے۔ زمانۂ حاضر کی جمہوریت اسلام کے اِسی فطری اور عادلانہ نظام کا نتیجہ ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

''اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں، آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے۔... اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کر کے امیر مملکت کا عزل ونصب جمہور کے اختیار میں دے دیا، جس کو وہ اپنے نمائندہ اہل حل وعقد کے ذریعہ استعمال کر سکیں، بادشاہ پرستی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اِس عادلانہ اور فطری نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی روح ہے اُسی طرز حکومت کی، جس کو آج جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔'' (۲/ ۲۲۳)

پیر کرم شاہ الازہری نے بھی مشورے کو اسلامی سیاست کا اہم ترین اصول قرار دیا ہے اور اُسے اسلام کے اُن کارناموں میں شامل کیا ہے جنھوں نے انسانی زندگی پر انقلابی اثرات مرتب کیے ہیں۔ جہاں تک استبدادی نظام کا تعلق ہے تو اُن کے نزدیک یہ زیادتی پر مبنی ہے جس سے گھٹن اور محرومی جنم لیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اِس آیت میں اسلامی سیاست کا ایک اہم ترین اصول بتایا گیا ہے۔ جب ہر طرف ملوکیت اور شخصی آمریت کا بول بالا تھا۔... اسلام نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں قابل قدر، دوررس اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں کیں، وہاں

سیاسی زندگی کو بھی نئے اصولوں سے آشنا کر دیا۔ اِن میں ایک شورائی نظام ہے۔ یعنی ہر کام جس کا تعلق عوام سے ہے، اِس بارے میں اِن لوگوں سے ضرور صلاح مشورہ کیا جائے۔ اِس سے نہ صرف یہ کہ رعایا کی دل جوئی ہوتی ہے، بلکہ اُنھیں اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور استبدادی طریقۂ کار سے جو مجبوری اور محرومی کی گھٹن قلب و روح کو ڈس رہی ہوتی ہے، اُس سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ نیز قومی معاملات میں کسی اہم معاملہ کے متعلق فرد واحد کا فیصلہ نافذ کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔'' (ضیاء القرآن ۴/ ۳۸۴)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بیان کیا ہے کہ نظم اجتماعی کو مشورے پر قائم نہ کرنا قانون الٰہی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کر لینا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام چلتا ہی مشورے سے ہے۔ ''تفہیم القرآن'' میں ہے:

''مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے، بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے''، بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں''۔ اِس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اِس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔'' (۴/ ۵۰۹)

'اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَيۡنَهُمۡ' کے معنی و مفہوم اور تشریحات کی روشنی میں اگر ہم اپنے سیاسی نظام کا جائزہ لیں تو درج ذیل نکات ناگزیر قرار پاتے ہیں:

اول، حکومت کے قیام و دوام کا انحصار عوام کی رائے پر ہونا چاہیے۔ وہی شخص یا گروہ حکومت چلائے جسے عوام اِس ذمہ داری پر فائز کریں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ مذہبی تقدس، علمی تفوق، موروثی نسبت، عوامی خدمت، شخصی صلاحیت یا اِس طرح کے کسی اور وصف کو بنیاد بنا کر مسلمانوں پر اپنا تسلط قائم کرے۔

دوم، مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے تمام ادارے مسلمانوں کی اجتماعیت کے تابع ہوں۔ ریاست کے لیے کیا دستور ہونا چاہیے اور اُسے کن اصولوں پر استوار کرنا چاہیے، اِس کی تجاویز تو ماہرین ہی ترتیب دیں، مگر ترک و اختیار اور ترمیم و اضافے کا فیصلہ عوام کریں۔ ہر انفرادی اور اجتماعی معاملے میں قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرنا ایمان و اسلام کا لازمی تقاضا ہے، لیکن اُن کی تفسیر و تاویل میں کس مفسر، کس محدث، کس فقیہ کی رائے کو قانون کا درجہ حاصل ہونا چاہیے، اِس کا فیصلہ بھی عامۃ المسلمین کی صواب دید پر منحصر ہو۔

سوم، ریاست کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کے حوالے سے بھی عوام الناس کے رجحان کی پیروی کی جائے۔

تعلیم، صحت، روزگار اور رفاہ عامہ کے معاملے میں ترجیحات کا تعین اُن کے میلانات کے مطابق ہو۔ اِسی طرح دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات اُنھی کی منشا کے مطابق استوار کیے جائیں اور بین الاقوامی معاملات میں اُنھی کے تصورات کو روبہ عمل کیا جائے۔

چہارم، تمام لوگوں کو مشاورت اور رائے دہی کے مساوی حقوق حاصل ہوں۔ مشاورت میں اگر اُن کی براہ راست شمولیت ممکن نہ ہو تو وہ اپنے نمایندوں کے ذریعے سے یہ حق استعمال کریں۔ مزید برآں، اگر کسی معاملے میں اُن کے مابین اتفاق رائے قائم نہ ہو تو کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے۔

پنجم، مسلمان اپنی قومی حیثیت میں اگر کوئی غلط فیصلہ کریں تو ارباب اقتدار اور اہل دانش پوری دردمندی کے ساتھ اُنھیں سمجھائیں اور ہر طریقے سے اُن کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔ لیکن اِس سے آگے بڑھ کر اُنھیں بزور قوت روکنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

یہی 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کا تقاضا ہے اور یہی جمہوریت ہے۔ آمرانہ اور استبدادی نظام اِس کا متضاد ہے، لہٰذا اسلام کے قانون سیاست میں اُس کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی نے بجا طور پر بیان کیا ہے:

''آمریت کسی خاندان کی ہو یا کسی طبقے، گروہ یا قومی ادارے کی، کسی حال میں بھی قبول نہیں کی جا سکتی، یہاں تک کہ نظم اجتماعی سے متعلق دینی احکام کی تعبیر و تشریح کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی بھی نہیں۔ وہ یہ حق یقیناً رکھتے ہیں کہ اپنی تشریحات پیش کریں اور اپنی آرا کا اظہار کریں، مگر اُن کے موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اُسی وقت حاصل ہوگی، جب عوام کے منتخب نمایندوں کی اکثریت اُسے قبول کر لے گی۔ جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اُسی کا ہے اور اُسی کا ہونا چاہیے۔ لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود وہ عملاً اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اُس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو حکومت بھی قائم کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی، خواہ اُس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اُسے امیر المومنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔'' (مقامات ۲۰۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الانبياء

(۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۱﴾ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ

———— ۲ ————

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

لوگوں کے لیے اُن کے حساب کا وقت قریب آ لگا ہے[۱۷۸] اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کیے جا رہے ہیں[۱۷۹]۔ اُن کے پروردگار کی طرف سے جو تازہ یاددہانی بھی اُن کے پاس آتی ہے، وہ

۱۷۸؎ یعنی مشرکین مکہ کے لیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب سنت الٰہی کے مطابق کسی وقت بھی عذاب سے دوچار ہو سکتے تھے۔ پیچھے سورۂ طٰہٰ کے آخر میں جس چیز کے بارے میں فرمایا تھا کہ اُس کا انتظار کرو، یہ اُسی کے قریب آ لگنے کا ذکر ہے، جس سے بغیر کسی تمہید کے یہ سورہ شروع ہوگئی ہے۔ یہ لوگ چونکہ خدا کی یاددہانی سے منہ موڑے ہوئے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اِن سے منہ موڑ کر ایک عام لفظ 'النَّاس' سے اِن کا ذکر فرمایا ہے۔

مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۲﴾ لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ وَاَسَرُّوا
النَّجۡوَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾
قٰلَ رَبِّىۡ يَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِى السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۴﴾

اُس کو سنتے ہیں تو کھیل میں لگے ہوتے ہیں۔ اُن کے دل غافل ہیں اور وہ ظالم چپکے چپکے (آپس میں) سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے ہی کیا، یہ تو تمھارے ہی جیسا آدمی ہے، پھر کیا آنکھوں دیکھتے اِس کے جادو میں پڑتے ہو؟[180] ۱-۳

(اِس پر) رسول نے کہا:[181] (یہ کیا سرگوشیاں کرتے ہیں)؟ میرا پروردگار ہر اُس بات کو جانتا ہے جو زمین و آسمان میں کی جائے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۴

۱۷۹؎ آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک غفلت، دوسرا اعراض۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...غفلت، یعنی زندگی کے اصل حقائق سے بے پروائی، بجاے خود بھی انسان کی شامت کی دلیل ہے اور ایک بہت بڑا جرم ہے، لیکن یہ جرم اُس صورت میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، جب کوئی اللہ کا بندہ جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہو، لیکن لوگ ایسے غفلت کے ماتے ہوں کہ اُس کی کوئی نصیحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۱۲۲)

۱۸۰؎ یہاں ’جادو‘ کا لفظ ٹھیک اُس مفہوم میں ہے، جس میں یہ ’إن من البیان لسحرًا‘ کے جملے میں آیا ہے، یعنی اُس کلام کا جادو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سنا رہے تھے۔ کسی کلام کی غیر معمولی تاثیر و تسخیر کے لیے یہ تعبیر اہل عرب کے ہاں بھی رائج تھی اور ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ اِس سے وہ اپنے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ تم جس چیز سے متاثر ہو رہے ہو، وہ سراسر الفاظ کی ساحری ہے، اِسے کوئی الہامی کلام اور اِس کے پیش کرنے والے کو خدا کا رسول قرار دے کر اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا نہ کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس کلام کا زور اور اِس کی سطوت و جلالت فی الواقع دلوں کو تسخیر کرتی ہے، لیکن اِس سے زیادہ اِس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ لفظ و معنی کے ربط و نظام کا غیر معمولی کمال ہے، جس کا مظاہرہ یہ نبوت و رسالت کے مدعی بن کر تمھارے سامنے کر رہے ہیں۔ تم سوچنے سمجھنے والے لوگ ہو، تمھیں تو اِس شخص کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ آخری بات، ظاہر ہے کہ مخاطبین کے اندر احساس برتری کو ابھارنے کے لیے کہی جاتی تھی۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۵﴾

یہی نہیں کہ صرف جادو کہتے ہیں، بلکہ اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ بھی کہ اِس نے اپنی طرف سے اِس قرآن کو گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ یہ محض ایک شاعر ہے۔[۱۸۲] سو (اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو) ہمارے پاس اُسی طرح کوئی نشانی لائے، جس طرح اگلے پیغمبر نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔[۱۸۳] ۵

۱۸۱؎ یعنی اُن کو مخاطب کیے بغیر اپنے دل میں کہا اور اِس طرح گویا معاملے کو اللہ کے حوالے کر دیا کہ وہی اِن کے فتنوں کا تدارک کرے گا۔ آگے اِسی تفویض کا بیان ہے۔

۱۸۲؎ اِس سے واضح ہے کہ قرآن کے مخاطبین اُس کی ہیبت وجلالت سے سخت مرعوب تھے، لیکن چونکہ ماننا نہیں چاہتے تھے کہ وہ خدا کا کلام ہے، اِس لیے کبھی اُس کو پیغمبر کے واہمہ کی خلاقی، کبھی اُس کی من گھڑت اور کبھی شاعر کی سحرآفرینی کہہ کر لوگوں کے دلوں پر سے اُس کی ہیبت کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۱۸۳؎ آیت میں 'کَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ' کے بعد 'بِالْاٰيٰتِ' کا لفظ دلالت قرینہ کی بنا پر حذف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِن کا یہ حربہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، اِن کے زعم کے مطابق، سب سے زیادہ کارگر حربہ تھا، اِس لیے کہ قرآن کی دعوت تمام تر آفاق وانفس اور عقل وفطرت کے دلائل پر مبنی تھی۔ وہ معجزات وخوارق اور نشانی عذاب کے بجائے لوگوں کو آنکھیں کھولنے اور عقل وبصیرت سے کام لینے پر ابھارتا تھا کہ ایمان کا فطری راستہ عقل ودل کا راستہ ہے۔ جو لوگ عقل وبصیرت سے کام نہیں لیتے، وہ خوارق دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے اور عذاب کی نشانی دیکھ کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ بات بالکل برحق تھی، لیکن مخالفین اُس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریز پر محمول کر کے لوگوں کو ورغلاتے کہ دیکھو، اگر یہ سچ مچ کوئی رسول ہوتے تو اِن کے لیے ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دینا کیا مشکل تھا! لیکن جب یہ اِس سے گریز کر رہے ہیں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے دعوے میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۲۵)

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ
اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٧﴾ وَمَا
جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿٨﴾ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ
فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٩﴾
لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠﴾ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ

ہم نے جن بستیوں کو ہلاک کیا ہے، اُن میں سے کوئی بھی اِن سے پہلے (اِس طرح کی نشانی دیکھ کر) ایمان نہیں لائی تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟ (کہتے ہیں کہ ہمارے جیسا آدمی ہے)۔ تم سے پہلے بھی ہم نے جس کو رسول بنا کر بھیجا، آدمیوں ہی میں سے بھیجا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو یاددہانی والوں سے پوچھ لو، اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو۔[184] ہم نے اُن رسولوں کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ (دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں تھے۔[185] پھر دیکھ لو کہ اُن سے اپنا وعدہ ہم نے پورا کر دیا[186] اور اُن کو اور (اُن کے ساتھ) جن کو ہم چاہتے تھے، بچا لیا اور حد سے گزرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ ۶-۹

(لوگو)، ہم نے تمھاری طرف بھی ایک کتاب نازل کر دی ہے، جس میں تمھارے حصے کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۸۴؎ اِس میں مخاطبین پر ایک نوعیت کی تعریض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد ہونے کے باوجود نہیں جانتے ہو تو اُن اہل کتاب سے پوچھ لو جن کے پاس اِس سے پہلے اِسی طرح یاددہانی بھیجی گئی۔ اِس بدیہی حقیقت کا انکار تو وہ بھی نہیں کر سکتے۔

۱۸۵؎ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو وہ کہتے تھے کہ یہ تو اُسی طرح کھاتے اور پیتے ہیں، جس طرح تم کھاتے اور پیتے ہو، پھر یہ رسول کس طرح ہو سکتے ہیں؟

۱۸۶؎ یعنی یہ وعدہ کہ اُن کے جھٹلانے والوں کو ہم لازماً ہلاک کر دیں گے اور اُنھیں اور اُن کے ساتھیوں کو نجات دیں گے۔ رسولوں سے متعلق یہ اُسی سنت الٰہی کا ذکر ہے، جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں۔

قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ
مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ﴿۱۳﴾قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰهُمْ
حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ﴿۱۵﴾

یاددہانی ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟[۱۸۷] کتنی ہی بستیاں ہم نے توڑ پھوڑ کر برابر کردیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہی تھیں[۱۸۸] اور اُن کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کیے۔[۱۸۹] پھر جب اُنھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو اُسی وقت وہاں سے بھاگنے لگے۔ (ہم نے کہا): اب بھاگو نہیں، اپنے اُسی سازوسامان کی طرف جس میں تم مزے کر رہے تھے اور اپنے اُنھی گھروں کی طرف لوٹ جاؤ جو تمھاری عشرت گاہیں تھیں[۱۹۰] تاکہ تم سے پوچھا جائے۔[۱۹۱] اُنھوں نے واویلا کیا کہ ہاے ہماری بدبختی، بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔ سو یہی واویلا کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے اُن کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا، گویا بجھے ہوئے پڑے ہیں۔[۱۹۲] ۱۰-۱۵

۱۸۷؎ یعنی اِس بات کو سمجھتے نہیں ہو کہ یہ خدا کی یاددہانی ہے اور اِس کو رد کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تمھاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے؟ تم کیوں اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو؟

۱۸۸؎ لفظ 'ظَالِم' یہاں 'ظالم لنفسه' کے معنی میں ہے۔ قرآن میں یہ متعدد مقامات پر اِس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۸۹؎ مطلب یہ ہے کہ نہیں مانو گے تو تمھارے ساتھ بھی یہی ہوگا اور اِس سے خدا کی دنیا اجڑ نہیں جائے گی۔ وہ تمھاری جگہ دوسروں کو لا بسائے گا۔ یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

۱۹۰؎ یہ فقرہ اصل میں مقدر ہے۔ اِس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں خطاب امرا و اغنیا سے ہے، جیسا کہ 'مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ' کے الفاظ سے واضح ہے، اور یہ اُنھی کے گھر ہیں۔

۱۹۱؎ یہ طنز و تضحیک کا جملہ ہے، یعنی تمھاری خبر لی جائے۔

۱۹۲؎ اصل میں 'حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا
لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ

ہم نے زمین و آسمان کو اور اُس کو جو اُن کے درمیان ہے، کچھ کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔[193] اگر ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اُس کا اہتمام اپنے پاس ہی سے کر لیتے، اگر ہم کو یہی کرنا ہوتا۔[194] ہرگز نہیں،[195] بلکہ (ایک دن آنے والا ہے[196] کہ) ہم حق کو باطل پر ماریں گے اور وہ اُس کا سر

’’...(اِس) میں یہ مضمون مضمر ہے کہ جس طرح گھاس کاٹ کر اُس کے خشک انبار میں آگ لگا دی جائے اور وہ راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے، اُسی طرح ہم نے اُن کو خاک اور راکھ بنا دیا۔ لفظ ’خٰمِدِيْنَ‘ یہاں مستعارلہٗ کی رعایت سے آیا ہے اور یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/ ۱۲۹)

۱۹۳؎ پیچھے فرمایا تھا کہ ایسا ایک دن آنا لازمی ہے، جس میں پوچھا جائے گا کہ کیا کرتے رہے ہو۔ یہ اُس کی دلیل بیان کی ہے کہ اگر جزا و سزا نہیں ہے، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کسی بھگوان کی لیلا، کسی کھلنڈرے کا کھیل یا کسی دیوتا کا اکھاڑا ہے۔ تم واقعی یہ سمجھتے ہو تو سن لو کہ ہم نے اِس کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اِس کی ایک ایک چیز گواہی دے رہی ہے کہ یہ نہایت پر حکمت کارخانہ ہے اور اِس کے بنانے والے نے اِسے ایک عظیم مقصد اور عظیم غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک دن ایسا لازماً آئے گا، جس میں یہ مقصد ظاہر ہو جائے گا۔

۱۹۴؎ یعنی اول تو یہ ہمارے شایان شان نہیں کہ ایسا کرتے، لیکن بالفرض کرنا ہی تھا تو اِس کے لیے روم کا یہ اکھاڑا بنا کر اپنے ہی ذی حس اور ذی شعور بندوں اور بندیوں کا تماشا دیکھنا تو ظلم اور شقاوت کی انتہا ہے۔ تم خداے رحمٰن کے بارے میں یہ خیال کس طرح کرتے ہو کہ اُس نے حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت اور ظلم و مظلومی کی یہ رزم گاہ صرف اِس لیے قائم کر رکھی ہے کہ خود ایک تماشائی بن کر اِس کا تماشا دیکھتا رہے۔ خدا کے بندو، یہ اُس کے عدل اور رحم کے بالکل منافی ہے۔

۱۹۵؎ یعنی یہ دنیا ہرگز کھیل تماشا نہیں ہے۔ تمھارا یہ خیال بالکل باطل ہے۔

۱۹۶؎ یعنی قیامت کا دن، جب اُس امتحان کا نتیجہ سامنے آئے گا جو اِس وقت برپا ہے کہ تم میں سے کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون باطل ہی پر قائم رہ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ

توڑ دے گا۔ پھر اُسی وقت دیکھو گے کہ وہ نابود ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے بڑی خرابی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔[197] ۱۶-۱۸

اُسی کے ہیں جو زمین اور آسمانوں میں ہیں اور جو اُس کی بارگاہ میں ہیں، (جنھیں اُس کی اولاد بنا کر پوجتے ہو)،[198] وہ اُس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔ رات دن اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، کبھی دم نہیں لیتے۔ ۱۹-۲۰

کیا اِنھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھیرا لیے ہیں جو اُس کو جلا اٹھاتے ہیں؟[199] اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔[200] سو اللہ، عرش کا

۱۹۷؎ یعنی یہ باتیں کہ دنیا محض ایک کھیل تماشا ہے اور آخرت اگر ہوئی بھی تو ہمارے شرکا وشفعا ہم کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔

۱۹۸؎ یہ فرشتوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں مشرکین عرب کا گمان تھا کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور وہ چونکہ اُن کو پوجتے ہیں، اِس لیے اُن کی سفارش سے وہ خدا کی پکڑ سے بچ جائیں گے۔

۱۹۹؎ یعنی زندگی بخشتے اور شاداب کر دیتے ہیں۔ اہل عرب کے علم الاصنام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو وہ خدا کی سلطنت میں ایک دور کی جگہ سمجھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ اُس کا نظم ونسق اُس نے دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے اور خود اُس سے الگ تھلگ آسمانوں پر اپنی حکومت چلا رہا ہے۔ یہ اِسی واہمے کی تردید ہے۔

۲۰۰؎ یہ توحید کی وہی دلیل ہے جسے دلیل توافق کہا جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس کائنات کے بقا کا انحصار اِس امر پر ہے کہ اِس کے مختلف اجزا وعناصر اور اِس

يُسْئَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ
وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾

مالک[201] اُن سب چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اُس کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور یہ سب جواب دہ ہیں[202]۔ کیا اِنھوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود ٹھیرا لیے ہیں؟ اِن سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ اُن کی یاددہانی موجود ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن کی یاددہانی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے ہیں[203]۔ نہیں، کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اِن میں سے زیادہ حق کو نہیں جانتے، اِس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں، اُن کی طرف ہم یہی وحی کرتے رہے ہیں[204] کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، سو میری ہی بندگی کرو[205]۔ ۲۱-۲۵

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے تمام اضداد میں نہایت گہرا توافق ہے۔ اگر یہ توافق ایک لمحے کے لیے بھی ختم ہو جائے تو اِس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ توافق صریح طور پر اِس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اِس پوری کائنات پر ایک ہی ذات کا ارادہ (mind) کارفرما ہے۔ اگر اِس میں بہت سے ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان و زمین کا باقی رہنا ناممکن تھا۔‘‘ (تدبرقرآن ۵/۱۳۶)

۲۰۱؎ یعنی کائنات کے تخت سلطنت کا مالک۔

۲۰۲؎ اِس لیے یہ تصور نہایت احمقانہ ہے کہ کوئی اُس کے ارادوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۲۰۳؎ یہ اب توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں انبیا علیہم السلام کی تذکیر کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن بھی موجود ہے جو میرے ماننے والوں کے لیے یاددہانی بن کر نازل ہوا ہے اور تورات، زبور، انجیل اور انبیا کے دوسرے صحائف بھی۔ اُنھیں دیکھ لو، اُن میں سے کسی میں بھی شرک کی تعلیم نہیں پائی جاتی، وہ سب توحید ہی کی شہادت دیتے ہیں۔

۲۰۴؎ اصل میں ’نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’نُوْحِيْ‘ سے پہلے ایک فعل ناقص عربیت کے اسلوب

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ
وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا
لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ
فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کے اولاد ہے۔ وہ (اِس تہمت سے) پاک ہے۔ فرشتے، جن کو یہ خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہیں، وہ اُس کی اولاد نہیں، بلکہ مقرب بندے ہیں[۲۰۶]۔ وہ اُس کے حضور کبھی بڑھ کر نہیں بولتے اور اُس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں[۲۰۷]۔ اُن کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، سب اُس کو معلوم ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے، اُس کے سوا جس کے لیے اللہ پسند فرمائے اور اُس کی ہیبت سے لرزتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے جو یہ کہنے کی جسارت کرے کہ اللہ کے سوا میں الٰہ ہوں تو اُس کو ہم جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اِسی طرح سزا دیتے ہیں[۲۰۸]۔ ۲۶-۲۹

پر حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۰۵؎ اوپر اگلوں کی جس یاد دہانی کا حوالہ دیا ہے، یہ اُس کی مزید وضاحت کر دی ہے۔

۲۰۶؎ اِس لیے کہ وہ شرک سے بالکل پاک ہیں، خدا کی سچی معرفت رکھتے ہیں اور کامل وفاداری کے ساتھ اُس کی بندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ اِس کا صلہ خدا کا تقرب ہے، نہ کہ زور واثر اور ناز و تدلل جس سے وہ، اِن کے زعم کے مطابق، خدا سے جو چاہیں گے، منوالیں گے۔

۲۰۷؎ مطلب یہ ہے کہ جن کی حیثیت خدا کے آگے یہ ہے، اُن کے بارے میں یہ خیال کر لینا کہ وہ خدا کی بارگاہ میں ایسا زور واثر رکھتے ہیں کہ اپنے ماننے والوں کو اُس کی پکڑ سے بچالیں گے، محض حماقت ہے۔

۲۰۸؎ یہ پوری تقریر اُسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے فرمائی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی یہ حیثیت مان لی جائے کہ وہ اپنی سفارش سے مجرموں کو چھڑا سکتا ہے تو عقیدۂ آخرت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا کے بارے میں بھی یہ ماننا ممکن نہیں رہتا کہ وہ کوئی عادل اور حکیم ہستی ہے، جس کے وعدوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا
مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ
تَمِیْدَبِھِمْ وَجَعَلْنَا فِیْھَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا

(یہ نشانیاں مانگتے ہیں)۔ کیا اِن منکروں نے بارہا دیکھا نہیں کہ آسمان اور زمین، دونوں بند ہیں[۲۰۹]، پھر ہم نے اُن کو کھول دیا[۲۱۰] اور ہم نے ہر زندہ چیز کو آسمان کے پانی ہی سے پیدا کیا ہے؟ کیا وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں گے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے کہ وہ اُن کو لے کر جھک نہ پڑے[۲۱۱] اور

۲۰۹؎ یعنی آسمان سے بارش نہیں ہوئی اور زمین سے سبزہ نہیں اگا۔ اِسی کو آیت میں 'رَتْق'، یعنی بند ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

۲۱۰؎ یعنی آسمان کو کھول دیا اور اُس نے دھڑا دھڑ پانی برسانا شروع کر دیا۔ اِس کے نتیجے میں زمین بھی کھل جاتی ہے اور نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔

یہ مشاہدہ جن حقائق پر دلالت کرتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس میں نہایت واضح دلیل توحید کی موجود ہے۔ اگر آسمان میں الگ اللہ اور زمین میں الگ معبود ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کو زندہ و شاداب رکھنے کے لیے اپنے ذخیرے کا پانی صرف کرتا؟ زمین و آسمان میں یہ زوجین کی سی سازگاری اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے اور دونوں پر اُسی کا ارادہ کارفرما ہے۔

دوسری شہادت اِس کے اندر معاد کی ہے۔ جب زمین خشک و بے آب و گیاہ یا بالفاظ دیگر مردہ ہو کر ازسرنو زندہ و شاداب ہو جاتی ہے تو موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو کیوں مستبعد خیال کیا جائے؟

تیسری شہادت اِس کے اندر انسان کے مسئول ہونے کی ہے۔ جب خدا نے انسان کی پرورش کے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین، سورج چاند اور ابر و ہوا، ہر چیز کو اُس کی خاطر سرگرم کار رکھتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس کو بالکل شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دے، محاسبے کا کوئی دن اُس کے لیے مقرر نہ کرے۔''

(تدبرقرآن ۵/۱۴۱)

۲۱۱؎ یہ غالباً وہی چیز ہے جسے جدید سائنس میں 'isostasy' کہا جاتا ہے۔ قرآن کے اِس بیان سے پہاڑوں کے بارے میں یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندروں کے نیچے کے کثیف مادے کو متوازن رکھنے

مَّحۡفُوۡظًا وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ
وَالۡقَمَرَ كُلٌّ فِيۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اُن پہاڑوں کے اندر راستے کے لیے درے بنائے تا کہ لوگ (اپنے لیے) راہ پا لیں۔[۲۱۲] اور آسمان کو ہم نے ایک محفوظ چھت بنا دیا[۲۱۳] اور یہ لوگ ہیں کہ اُس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک (اپنے) ایک مدار میں گردش کر رہا ہے۔[۲۱۴] ۳۰-۳۳

کے لیے سطح زمین پر ابھرے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو زمین اُسی طرح ہلتی رہتی، جس طرح اب زلزلہ آ جائے تو ہلتی ہے۔ اِس کے لیے جو الفاظ قرآن میں آئے ہیں، اُن میں 'اَنۡ' سے پہلے لام علت عربیت کے اسلوب پر مقدر ہے۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ اُسی طرح کا اسلوب ہے، جیسے ہم کہتے ہیں: 'ھذا دواء للحمی'۔

۲۱۲؎ یعنی سفر کی راہ بھی اور جس پروردگار کی قدرت، عظمت اور حکمت اِن راستوں کے وجود سے ظاہر ہوتی ہے، اُس تک پہنچنے کی راہ بھی۔ یہ بلیغ فقرہ، اگر غور کیجیے تو نہایت خوبی کے ساتھ اِن دونوں مفاہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۲۱۳؎ یعنی ایک ایسی چھت جس کی وسعت و پہنائی کی کوئی حد نہیں ہے، لیکن نہ کہنہ ہوتی ہے، نہ اِس میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسی محکم ہے کہ دیکھنے والے اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ اور یہی نہیں، اب تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اِس کی ترکیب اِس طرح ہے کہ یہ ہم کو سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے بھی بچاتی ہے اور شہاب ثاقب کی اُس بارش سے بھی جو دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں۔ پھر اِس کے خالق نے اِسے ایسے قمقموں سے سجا دیا ہے جن کی حسن افروزی اور فیض بخشی ہر اندازے اور خیال سے باہر ہے۔

۲۱۴؎ یہ اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کوئی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا، بلکہ ٹھیک اُس قانون کے مطابق گردش کرتا رہتا ہے جو اُس ہستی نے اُس کے لیے مقرر کر دیا ہے، جس کے ہاتھ میں اُس کی باگ ہے اور جو کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے اُس کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معارف نبوی

جاوید احمد غامدی

تحقیق و تخریج: محمد حسن الیاس

اسلام اور فطرت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

—— ۱ ——

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ الْأَنْصَارِيِّ[1]، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا، وَعَلٰى جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ[2]، فِيْهِمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ، وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ، وَعَلٰى بَابِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ: أَيُّهَا النَّاسُ، ادْخُلُوا الصِّرَاطَ جَمِيعًا، وَلَا تَتَعَرَّجُوا، وَدَاعٍ يَدْعُو مِنْ فَوْقِ الصِّرَاطِ، فَإِذَا أَرَادَ يَفْتَحُ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ، قَالَ: وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ، فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ، وَالصِّرَاطُ الْإِسْلَامُ، وَالسُّوْرَانِ: حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَالْأَبْوَابُ الْمُفَتَّحَةُ: مَحَارِمُ اللّٰهِ، وَذٰلِكَ الدَّاعِي عَلَى رَأْسِ الصِّرَاطِ: كِتَابُ اللّٰهِ، وَالدَّاعِي مِنْ فَوْقَ الصِّرَاطِ: وَاعِظُ اللّٰهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ“.

نواس بن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

نے سیدھے راستے کی مثال دی ہے کہ اُس کے دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ دونوں میں دروازے کھلے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ راستے کی ابتدا میں ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ لوگو، سب اندر آ جاؤ اور راہ چھوڑ کر کراہ نہ چلو۔ اور راستے کے اوپر بھی ایک منادی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر دروازوں کا پردہ کچھ بھی اٹھانا چاہتا ہے تو وہ پکار کر کہتا ہے: خبردار، پردہ نہ اٹھانا، اِس لیے کہ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ سو یہ راستہ اسلام ہے، دیواریں اللہ کے حدود ہیں، کھلے ہوئے دروازے اُس کی قائم کردہ حرمتیں ہیں، راستے کی ابتدا میں پکارنے والی، وہ خدا کی کتاب ہے، اور اوپر سے پکارنے والا منادی خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہے۔[1]

۱۔ یہ ٹھیک اُسی حقیقت کا بیان ہے جو قرآن مجید نے ’وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا . فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ‘ (اور نفس اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی بدی اور نیکی اُسے سجھا دی) کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرآن خدا کا الہام ہے، اُسی طرح کا ایک الہام خدا نے انسان کی فطرت میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ دین کی ہدایت وہ اصلاً اپنے خالق کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ قرآن اُسی ہدایت کی یاددہانی ہے اور دونوں میں اِس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ فطرت میں جو کچھ بالاجمال ودیعت ہے، قرآن اُس کی تفصیل کر دیتا ہے۔ تاہم فطرت کی یہ ہدایت خدا کی منادی اُسی وقت بنتی ہے، جب انسان اپنے دل و دماغ کو مسلمان بنا لیتا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں ’في قلب كل مسلم‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’قلب‘ کے لیے ’مسلم‘ کی تخصیص اِسی بات پر دلالت کے لیے ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کو مسند احمد، رقم ۱۷۶۳۴ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت اِن کتابوں میں نقل ہوئی ہے: سنن ترمذی، رقم ۲۸۰۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۰۷۱۹۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۱۸۰۰، ۱۸۰۱۔

۲۔ سنن ترمذی، رقم ۲۸۰۵ یہاں ’سُوْرَان‘ کے بجائے ’دَارَان‘ نقل ہوا ہے، یعنی دو گھر۔

۲

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سِمْعَانَ الْأَنْصَارِيِّ،[۱] قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ عَنِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ؟ فَقَالَ: "الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ[۲]، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ".

نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور بدی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک پیدا کر دے اور تم یہ پسند نہ کرو کہ دوسرے لوگ اُسے جانیں[۱]۔

۱۔ خیر و شر کے بارے میں یہ فطرت کی گواہی کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اگر شب و روز اِس کو خاموش کر دینے میں نہ لگا رہے تو یہ ہر وقت اُس کو میسر ہوتی ہے اور بہت سے معاملات میں بالکل فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۴۶۳۸ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل کتابوں میں نقل ہوئی ہے:

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۴۷۵۱۔ مسند احمد، رقم ۱۷۲۹۱، ۱۷۲۹۲، ۱۷۲۹۳۔ سنن دارمی، رقم ۲۷۰۴۔ الادب المفرد، رقم ۲۹۳، ۳۰۰۔ صحیح مسلم، رقم ۴۶۳۹۔ سنن ترمذی، رقم ۲۳۲۴۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۴۶۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۰۲۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۱۳۹۔

۲۔ سنن ترمذی، رقم ۲۳۲۴ میں 'صَدْرِكَ' کے بجائے 'نَفْسِكَ' نقل ہوا ہے۔

المصادر والمراجع

ابن حبان، أبو حاتم بن حبان. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط ٢. تحقيق: شعيب

الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر، على بن حجر أبو الفضل العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري.** (د.ط). تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار المعرفة.

ابن قانع. (١٤٨١هـ/١٩٩٨م). **المعجم الصحابة.** ط١. تحقيق:حمدي محمد. مكة مكرمة: نزار مصطفٰی الباز.

ابن ماجة، ابن ماجة القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجة.** ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن منظور، محمد بن مكرم بن الأفريقي. (د.ت). **لسان العرب.** ط١. بيروت: دار صادر.

أبو نعيم ، (د.ت). **معرفة الصحابه.** ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دارالكتاب العلمية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل.** ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري، محمد بن إسماعيل. (١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م). **الجامع الصحيح.** ط٣. تحقيق: مصطفٰی ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

بدر الدين العيني. **عمدة القاري شرح صحيح البخاري.** (د.ط). بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البيهقي، أحمد بن الحسين البيهقي. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرٰی.** ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

السيوطي، جلال الدين السيوطي. (١٤١٦هـ/ ١٩٩٦م). **الديباج على صحيح مسلم بن الحجاج.** ط ١. تحقيق: أبو إسحٰق الحويني الأثري. السعودية: دار ابن عفان للنشر والتوزيع.

الشاشي، الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي.** ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين اللّٰه. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

محمد القضاعي الكلبي المزي. (١٤٠٠هـ/١٩٨٠م). **تهذيب الكمال في أسماء الرجال.**

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ط ١ . تحقيق: بشار عواد معروف. بيروت: مؤسسة الرسالة.

مسلم، مسلم بن الحجاج. (د.ت). **صحيح المسلم.** ط ١ . تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرىٰ.** ط٢ . تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرىٰ.** ط ١ . تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سیر و سوانح

محمد وسیم اختر مفتی

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

(۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فضائل حضرت عائشہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ باقی عورتوں پر اتنی ہی فضیلت رکھتی ہیں، جتنی فوقیت ثرید (شوربے میں تر کی ہوئی روٹی، porridge) بقیہ کھانوں پر رکھتا ہے۔ مردوں میں بہت کامل ہوئے، جب کہ عورتوں میں حضرت مریم اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ ہی درجۂ کمال کو پہنچیں (بخاری، رقم ۳۴۳۳۔ مسلم، رقم ۶۳۵۳۔ ترمذی، رقم ۱۸۳۴۔ نسائی، رقم ۳۳۹۹)۔

حضرت عمرو بن عاص نے، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذات سلاسل کے موقع پر سپہ سالار مقرر فرمایا تھا، آپ سے پوچھا: آپ کو کون سا انسان سب سے بڑھ کر محبوب ہے؟ آپ نے جواب فرمایا: ''عائشہ۔'' پوچھا: مردوں میں سے کون؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''ان کے والد (ابوبکر)۔'' انھوں نے پھر سوال کیا: ان کے بعد؟ جواب فرمایا: ''عمر'' (بخاری، رقم ۳۶۶۲۔ مسلم، رقم ۶۲۵۳۔ ابن ماجہ، رقم ۱۰۱)۔ یہی سوال حضرت عائشہ سے کیا گیا: ابوبکر و عمر کے بعد آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا؟ جواب دیا: ابوعبیدہ بن جراح۔ سوال کیا گیا: ان کے بعد کون؟ تو حضرت عائشہ خاموش رہیں (ترمذی، رقم ۳۶۵۷)۔

سیدہ عائشہ کو فقہ اسلامی پر عبور تھا۔ فقہی مسائل پر ان کی رائے وقیع ہوتی۔ اکابر صحابہ وارثت کے مسائل ان سے حل کرواتے۔ عروہ کہتے ہیں: میں نے فقہ، طب حتیٰ کہ شاعری میں کسی کا علم حضرت عائشہ سے زیادہ نہیں پایا۔ موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ سے زیادہ فصیح کسی کو نہ پایا (ترمذی، رقم ۳۸۸۴)۔ عروہ بن زبیر شعری روایات سے خوب واقف تھے۔ ان سے پوچھا گیا: آپ اتنے شعر کیسے سنا لیتے ہیں؟ بتایا: میرے شعر میری خالہ عائشہ ہی کے بیان کردہ ہیں۔ انھیں جو خیال آتا، اس پر شعر پڑھ دیتیں۔

زہری کہتے ہیں: اگر تمام ازواج مطہرات اور سب عورتوں کے مجموعی علم کا حضرت عائشہ کے علم سے موازنہ کیا جائے تو بھی ان کا علم زیادہ رہے گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں: ہمیں کوئی حدیث سمجھ نہ آتی تو حضرت عائشہ سے رجوع کرتے اور ہمارا مسئلہ حل ہو جاتا (ترمذی، رقم ۳۸۸۳)۔ ائمہ نے ایسے مسائل اور ایسی روایات کو جمع کر دیا ہے جو محض حضرت عائشہ ہی کے ہاں ملتے ہیں۔ تاہم یہ روایت بے اصل ہے: ''اپنے دین کا ایک حصہ اس حمیرا سے حاصل کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کی براءت میں نازل ہونے والی آیات افک ہی ان کی فضیلت بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت عائشہ نے خود اپنے دس فضائل گنوائے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آنے والی واحد کنواری خاتون ہیں۔ آپ کی ازواج میں سے کوئی ایسی نہ تھی جس کے ماں باپ، دونوں مہاجر ہوں۔ اللہ نے آسمان سے ان کی براءت نازل کی اور ان سے مغفرت اور عمدہ رزق کا وعدہ کیا گیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کا رشتہ تجویز کیا، وہ حضرت عائشہ کی صورت میں آپ کی ہتھیلی میں نمودار ہوئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ ایک ہی برتن سے غسل کرتے (بخاری، رقم ۲۵۰۔ مسلم، رقم ۶۵۷۔ ابن ماجہ، رقم ۳۷۷)۔

آپ قیام اللیل کرتے تو حضرت عائشہ آگے لیٹی ہوتیں، جیسے جنازہ پڑا ہو (مسلم، رقم ۱۰۷۵۔ ابن ماجہ، رقم ۹۵۶)۔

ان کے بستر میں وحی نازل ہوئی، فرشتے ان کے حجرے کو اپنے گھیرے میں لے لیتے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس دن ہوئی، جب حضرت عائشہ کی باری تھی۔ آخری وقت میں آپ کا سر حضرت عائشہ کے سینے اور گردن کے درمیان ٹکا ہوا تھا۔ حضرت عائشہ کے حجرے ہی میں آپ کی تدفین ہوئی۔

جنگ جمل سے پہلے حضرت عمار اور حضرت حسن کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑے خطاب کر رہے تھے، ایک شخص نے سیدہ عائشہ کو گالی دے ڈالی۔ حضرت عمار نے اسے ڈانٹا اور کہا: دور ہو جا اولاخیرے، نیچ انسان! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ کو ایذا دے رہا ہے۔ عائشہ دنیا و آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے یہ معلوم کرنے کے لیے تم کو آزمایش میں ڈالا ہے کہ تم اس کی اطاعت کرتے ہو یا عائشہ کی؟ (بخاری، رقم ۳۷۷۲۔ ترمذی، رقم ۳۸۸۹)۔

مسروق حضرت عائشہ کی روایت اس طرح بیان کرتے: ہمیں صدیقہ بنت صدیق، پاک دامن، اللہ کی طرف سے بے قصور قرار دی گئی سیدہ عائشہ نے بتایا۔

سیدہ عائشہ نے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: آپ کی کون سی ازواج جنت میں جائیں گی؟ فرمایا: تم ان میں شامل ہوگی (مستدرک حاکم، رقم ۶۷۴۳)۔ یہ بھی فرمایا: مجھے جنت میں عائشہ نظر آئی تو میری موت بھلی ہو گئی۔

ایک عورت دو بچیاں اٹھائے حضرت عائشہ سے سوال کرنے آئی۔ ان کے پاس ایک ہی کھجور تھی (تین کھجوریں، مسلم، رقم ۶۷۸۷) جو انھوں نے اسے دے دی۔ عورت نے کھجور (ایک یا تینوں) فوراً اپنی بچیوں میں بانٹ دی اور خود نہ چکھی۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصہ سن کر فرمایا: جس پر ان بیٹیوں کی ذمہ داری ہو، وہ ان سے اچھا سلوک کرے اور ان کی طرف سے آنے والی آزمایش پر صبر کرے تو یہ اس کے لیے دوزخ سے ڈھال بن جائیں گی (بخاری، رقم ۵۹۹۵۔ مسلم، رقم ۶۷۸۶۔ ترمذی، رقم ۱۹۱۵)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عروہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ کے پاس ستر ہزار درہم آئے، انھوں نے فوراً انفاق کر دیے۔ ام ذرہ کہتی ہیں: حضرت عبداللہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کو دو توڑوں میں ایک لاکھ درہم بھجوائے۔ وہ روزے سے تھیں، فوراً تمام دراہم بانٹ دیے۔ روزہ کھلنے کا وقت ہوا تو کنیز سے افطاری مانگی۔ اس نے جواب دیا: آپ ایک درہم کا گوشت ہی منگوا لیتیں؟ کہا: مت ڈانٹو! مجھے یاد کرایا ہوتا تو لے لیتی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عائشہ کے محبوب ترین انسان تھے۔ حضرت عائشہ کے پاس رزق الٰہی میں سے جو کچھ آتا، صدقہ کر دیتیں اور اپنے پاس کچھ نہ رکھتیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: عائشہ رک جائیں، نہیں تو میں ان پر حجر کا دعویٰ کر دوں گا، قاضی یہ فیصلہ کرے کہ نادان ہونے کی وجہ سے ان کے مالی تصرفات پر پابندی ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا: اس نے مجھ پر حجر کرنے کو کہا ہے، مجھے کوئی نذر دینی ہوگی اگر عبداللہ سے کبھی بات بھی کی۔ ناراضی نے طول پکڑا تو حضرت عبداللہ بن زبیر نے قریش کے بڑے آدمیوں خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں سے سفارش کرائی، لیکن حضرت عائشہ نے کہا: میں کوئی سفارش مانوں گی نہ نذر کا کفارہ دوں گی۔ آخر کار انھوں نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن اسود اور حضرت مسور بن مخرمہ سے درخواست کی۔ یہ دونوں اصحاب حضرت عائشہ کے ہاں پہنچے، انھیں اندر جانے کی

اجازت ملی تو ان کے پیچھے پیچھے حضرت عبداللہ بن زبیر بھی پردے کے پیچھے اپنی خالہ کے پاس چلے گئے اور ان کے گلے لگ کر رونے لگے۔ ادھر حضرت ابن زبیر نے منت سماجت کی، ادھر حضرت مسور اور حضرت عبدالرحمٰن صلح کی التجا کرنے لگے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا حوالہ بھی دیا کہ تین راتوں سے زیادہ ترک ملاقات کرنا جائز نہیں۔ اب حضرت عائشہ پر بھی رقت طاری ہو گئی، انھوں نے کہا: میری نذر سخت ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن زبیر نے انھیں دس غلام عطیہ کیے جو انھوں نے آزاد کر دیے۔ وہ غلام دیتے گئے اور حضرت عائشہ آزاد کرتی رہیں، حتیٰ کہ چالیس کی گنتی پوری ہو گئی۔ حضرت عائشہ نے کہا: کاش! میں (اس سے بھی) بڑے کام کی نذر مان لیتی اور وہ پوری ہو جاتی (بخاری، رقم ۶۰۷۵)۔

حضرت عائشہ مسلسل روزے رکھتی تھیں۔

حضرت عائشہ سرخ و سفید اور خوب صورت تھیں، اسی لیے انھیں حمیرا کا لقب عطا ہوا۔ جمال نسوانی میں حضرت زینب، حضرت جویریہ اور حضرت صفیہ بھی کم نہ تھیں، لیکن ذہانت، باریک بینی، دینی مسائل کے فہم و شعور اور اجتہاد و استنباط میں حضرت عائشہ کا ایک الگ مقام ہے۔

حضرت عائشہ، حضرت خدیجہ کس کی فضیلت زیادہ؟

یہ مسئلہ شروع سے علما کے درمیان وجۂ نزاع رہا ہے۔ شیعہ کسی مومنہ کو حضرت خدیجہ کے برابر نہیں سمجھتے۔ ان کی تائید آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ''اللہ نے مجھے ان سے بہتر خاتون نہیں دی۔ وہ اس وقت ایمان لائیں، جب لوگوں نے میری نبوت کا انکار کیا؛ انھوں نے تب میری تصدیق کی، جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا؛ انھوں نے اپنے مال سے میری مدد کی، جب لوگوں نے مجھے محروم کیا؛ انھوں نے مجھے اولاد کی نعمت دی جب کہ (ماریہ کے سوا) دوسری ازواج کی گود خالی رہی'' (مسند احمد، رقم ۲۴۸۶۴)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ پر سلامتی بھیجی۔ وہ مردوں، عورتوں میں سب سے پہلے اسلام لائیں، وہ صدیقہ تھیں۔ اہل سنت کے کچھ علما حضرت عائشہ کو افضل جانتے ہیں۔ ان کے دلائل یہ ہیں: سیدہ عائشہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب اور محبوب ترین رفیق حضرت ابوبکر صدیق کی صاحب زادی تھیں۔ وہ حضرت خدیجہ سے زیادہ علم رکھتی تھیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے زیادہ کسی زوجہ سے محبت نہ کرتے تھے۔ ساتویں آسمان سے ان کی براءت نازل ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد انھوں نے لاتعداد احادیث روایت کیں اور اہل اسلام کو علم وافر منتقل کیا۔ ذہبی حضرت خدیجہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی افضلیت کے قائل ہیں، جب کہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس باب میں طرفین کے دلائل یکساں قوت رکھتے ہیں، اس لیے توقف کرنا اور واللہ اعلم کہنا ہی موزوں ہے۔

لباس و زیبایش

شمیسہ حضرت عائشہ سے ملنے گئیں، تب انھوں نے باریک کرتا پہنا ہوا تھا جو عصفر (safflower، گل رنگ) سے رنگا ہوا تھا۔ ان کا دوپٹا اور نقاب بھی گل رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ وہ حالت احرام میں بھی عصفر سے رنگے زرد کپڑے اور سونا زیب تن کر لیتی تھیں۔ ان کے جسم پر سرخ کرتا بھی دیکھا گیا۔

حضرت عائشہ کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں (بخاری: باب اللباس، ۵۶)۔ حضرت عائشہ کے بھتیجے قاسم بن محمد کہتے ہیں: واللہ، میں نے حضرت عائشہ کو زرد کپڑے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے دیکھا ہے۔

ایک سفر میں حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ ان کے سر پر لگائی ہوئی زرد خوشبو بہ کر منہ پر لگ گئی۔ آپ نے فرمایا: عائشہ، اب تمھارا رنگ خوب نکل آیا ہے۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: منہدی پاک درخت اور پاکیزہ پانی ہے۔ ایک عورت نے ان سے پوچھا: منہدی سے بال رنگنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جواب دیا: اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن میں اس سے بال رنگنا اس لیے پسند نہیں کرتی، کیونکہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بو اچھی نہیں لگتی تھی (نسائی، رقم ۵۰۹۳)۔

بکرہ بنت عقبہ کو فرمایا: اگر تم اپنے شوہر کے لیے بھنووں کے بال اکھاڑ کر آنکھوں کو خوب صورت بنا سکتی ہو تو ضرور بنا لو۔

حفصہ بنت عبدالرحمٰن باریک اوڑھنی لے کر حضرت عائشہ کے پاس گئیں تو انھوں نے اسے پھاڑ دیا اور موٹی چادر دے دی۔

محمد بن اشعث نے حضرت عائشہ کو پوستین ہدیہ کرنے کا پوچھا تو انھوں نے کہا: میں مردہ جانور کی کھال پہننا پسند نہیں کرتی۔ تب انھوں نے ایک جانور ذبح کر کے اس کی کھال کی پوستین بنوائی تو انھوں نے پہن لی۔

ایک موقع پر حضرت عائشہ نے حبشہ کی اوڑھنی لی اور یمن کے علاقے غراب کی سیاہ چادر اوڑھی۔

ایمن حبشی کہتے ہیں: میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ یمن کے کھردرے سرخ کپڑے قطر کی قمیص پہنے ہوئے تھیں جو مشکل سے پانچ درہم مالیت کی ہو گی۔ فرمایا: میری اس باندی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو، اس قمیص کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گھر میں بھی پہننا پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں میرے پاس اسی کپڑے کا ایک کرتا تھا۔ مدینہ میں جس عورت کو شادی بیاہ کے وقت بننے سنورنے کی ضرورت ہوتی، وہ یہ کرتا مجھ سے مانگ کر لے جاتی (بخاری، رقم ۲۶۲۸)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ میں نے سونے کے دو کنگن پہن رکھے ہیں تو فرمایا: میں تمھیں اس سے بہتر زیور نہ بتاؤں، اگر تو انھیں اتار کر چاندی کے دو کڑے پہن لے اور انھیں زعفران (saffron) سے زرد کر لے تو وہ زیادہ خوب صورت لگیں گے (نسائی، رقم ۵۱۴۶)۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح المختصر (بخاری، شرکۃ دارالارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دارالارقم)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ، امین اللہ وثیر)، Wikipedia, the free encyclopedia۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقالات

اشراق

ساجد حمید

تعددِ معنی اور دلالتِ لسانی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زبان اپنے معنی کی ادائیگی میں کامیاب ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عالمِ عمل میں ہونا چاہیے، نہ کہ مجرد عالمِ عقل میں۔ صدیوں سے ہم افلاطون کے طرزِ فکر کے اسیر ہیں۔ اس کا منہج یہ تھا کہ ہماری عقل علم کا ماخذِ کُل ہے اور ہمارا حسی تجربہ، یعنی ہمارے حواس خطا کار ہیں۔ اس طرزِ فکر نے صدیوں تک انسان کو علوم میں ترقی سے روکے رکھا۔ انسان کی اس طرزِ فکر میں جو ترقی ہوئی، وہ ایک طرف اہل فلسفہ کی عقلی موشگافیاں تھیں اور دوسری طرف تصوف کی وجدانی خود فریبیاں۔ علم اسی میدان میں پھنسا رہا، اور اقبال کے الفاظ میں اس دانشِ برہانی نے حیرت کے سوا ہمیں کچھ عطا نہیں کیا۔

اس منہج کی تاثیر اور گرفت اتنی زیادہ تھی کہ کوئی حتمی سے حتمی چیز بھی جب اس کے معیار پر پوری نہ اتری تو بے وقعت قرار پائی۔ مثلاً ان کے مطابق وحی محض ظاہریت اور معیار میں پست ٹھیری، تجربات پر مبنی علم محض دنیوی اور سفلی سے شاید کچھ بڑا درجہ پا کر علم آلی قرار پایا۔ لہٰذا، نہ فہمِ وحی کے لیے ذہین عناصر آگے بڑھے اور نہ مادی علوم کے لیے۔ لہٰذا امت کے بڑے اذہان فلسفہ و تصوف کی بھینٹ چڑھ کر خانقاہوں اور فلسفیانہ مدارس کی روح و رواں بن کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وحی پر اعتماد کرنے والے بے وزن ٹھیرے۔ پھر امام رازی وغیرہ نے وحی کو اس معیار پر پورا دکھانے کے لیے ''التفسیر الکبیر'' جیسی تفاسیر لکھی۔ بالکل اسی طرح، جس طرح ہمارے عہد میں سرسید وغیرہ نے قرآن کو سائنس کے معیار پر دکھانے کے لیے تفسیریں لکھیں۔

عقلی منہج اور حقیقتِ واقعہ

افلاطونی طرزفکر کا اصل طریقہ یہ ہے کہ حقائقِ واقعہ (ground realities) سے ہٹ کر خالص ذہنی بنیادوں پر ایک نظریہ بنائیں گے اور پھر اسی کے نتائج و عواقب عقل کی بھٹی سے کشید کر کے دکھائیں گے۔ مثلاً ایک عقلی مقدمہ قائم ہو گا، کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آ سکتی۔ تو سوال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کہاں سے آئے؟ جواب آیا کہ چیزیں دو قسم کی ہیں: ایک واجب الوجود (necessary being) اور ایک حادث یا ممکن الوجود (contingent)۔ واجب الوجود وہ ہے جو بس از خود ہے، اس کا کوئی آغاز نہیں ہے اور اس کا وجود ہی حقیقی وجود ہے۔ ممکن الوجود وہ ہے جو اصلاً نہیں ہے، مگر وجود میں آ سکتا ہے۔ جب یہ عقلی مقدمات مان لیے گئے تو سوال پیدا ہوا کہ کائنات ممکن الوجود ہے کہ واجب الوجود؟ ایک گروہ نے اپنے خیال میں اسے واجب الوجود مانا اور دوسرے نے حادث۔ جس نے حادث مانا، اس کے نزدیک یہ حقیقی وجود نہیں تھا۔ لہٰذا ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے کی صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ کائنات کا ہونا محض خواب، واہمہ یا عکس و تجلی قرار پایا، یعنی ایک ٹھوس حقیقی دنیا اس عقلی فریب میں بے وجود قرار پائی۔ چنانچہ صدیوں بعد ڈیکارٹ نے منوایا کہ کم از کم اپنے آپ کے ہونے کو تو مانا جائے۔ ڈیکارٹ نے ذاتِ خویش کی موجودگی اندھوں کو نہیں منوائی تھی، بلکہ ان دانا و بینا لوگوں کو منوائی تھی جو فلاسفر کہلاتے اور ذہین ترین عناصر سمجھے جاتے ہیں[1]۔ اگر آپ اس پر سوال اٹھائیں گے کہ حضور، حقیقتِ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ دنیا موجود ہے، کیا آپ کو دکھائی نہیں دیتی؟ آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں! تو یہ افلاطونی طرز کا فلسفی آپ کو ظاہر پرست اور عقلی اعتبار سے پست قرار دے دے گا۔ کبھی آپ کو کہے گا کہ یہ حواس کا دھوکا ہے اور کبھی آپ کو کہے گا کہ آپ کی عقل اتنی بالیدہ نہیں ہے کہ ہماری بات سمجھ سکیں، وغیرہ۔ ایسا وہ اس لیے کہتے ہیں کہ اپنے عقلی موشگافی کے سوا ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے[2]۔

لسانی میدان میں بھی یہی حرکت ہوئی۔ حقیقی دنیا میں اس کی دلالت دیکھنے کے بجائے، کچھ اسی طرح کے عقلی مقدمات قائم کر لیے گئے۔ پھر ان سے کچھ تصورات کشید کیے گئے۔ حالاں کہ عملی میدان میں زبان ان نظریات کو ویسے ہی جھٹلاتی ہے، جیسے کائنات کو واہمہ قرار دینے والوں کو کائنات کا وجود جھٹلاتا ہے۔

---

[1] معلوم رہے کہ کچھ فلسفی ابھی بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔

[2] بعضے اس بات پر بھی ناراض ہو جائیں گے جب آپ ان سے مثال مانگیں گے۔ عقل کے تراشیدہ تصورات کی ضروری نہیں ہے مثال ہو۔ وہ تو محض utopian idea ہوتا ہے، جس کی مثال عموماً نہیں ہوتی، کیونکہ مثالیں تو عملی اور حقیقی زندگی میں ہوتی ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

غالب کے اشعار کا یہی وہ تحیر ہے جسے اقبال نے حیرت کی فراوانی کہا ہے:

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

جس طرح وہم کا مریض اپنے وہم کو حقیقی سمجھ رہا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح فلسفی اپنے عقلی وہموں کو حق سمجھ رہا ہوتا ہے اور حقیقی باتوں کو وہم۔ گویا کچھ لوگوں کی آنکھوں اور حواس کو وہم لاحق ہوتا ہے تو کچھ کی عقلوں کو۔ افلاطون کو لاکھ قائل کرلیں کہ جناب آپ کا عالم امثال آپ کے ذہن کی اختراع ہے اور بس! لیکن وہ اپنے نظریے کو ترک نہیں کرے گا، کیونکہ اس کی عقلی تنگ بندیوں نے یہی سجھایا ہے۔ وہ عقل کے اس فریب سے باہر نہیں نکلے گا۔ ایسے فلسفیوں کو دنیا بھر کی مانی ہوئی موجود چیزیں غیر موجود اور غیر موجود چیزیں موجود لگتی ہیں۔

ہمارا لسانی تجربہ بھی اسی کائنات کے وجود کی طرح ایک طرف لے جاتا ہے اور فلسفیانہ طرز پر سوچنے والوں کا طرز فکر دوسری طرف۔ اس منہج کے حاملین سے بعید نہیں ہے کہ وہ زبان میں موجود دلالت کا انکار کر دیں۔ جب عقلی نظام الفکر محسوس کائنات کا انکار کر سکتا ہے، تو وہ محسوس لسانی دلالت کا انکار کیوں نہیں کرسکتا! کیونکہ اس نے اپنے طرز فکر کے مطابق گھوڑے کے دانت گننے نہیں ہیں، بلکہ ان کی تعداد جاننے کے لیے عقلی گھوڑے دوڑانے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جاننے کے لیے کہ گھوڑے کے دانت کتنے ہیں، اس کے دانت گننے نکل پڑنا ظاہریت، حواس پرستی اور عقلی پستی کی علامت ہے۔ ان کے لیے دانش برہانی تو یہ ہے کہ گھر بیٹھے محض عقلِ تام کی مدد ہی سے کسی سوال کا جواب پا لیا جائے، (خواہ وہ حقیقت کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو)۔ لہٰذا، کلام سو فی صد قطعی الدلالت ہو جائے، یہ عقلیت پرست اسے قطعی نہیں مان سکتے کیونکہ وہ کچھ اوہام کو عقلی طور پر حق تسلیم کیے بیٹھے ہیں، یہ فریبِ عقل کا بری طرح شکار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کے نزدیک زبان کی دلالت کو عقلی موشگافیوں کی بنا پر ظنی مانا جاتا ہے اور اس کے خلاف روزمرہ کا عملی ثبوت بے وزن قرار پاتا ہے۔

لسانی دلالت اور عقلی اوہام

عقلی اوہام کی ایک دو مثالیں دیکھتے ہیں، تاکہ آپ پر واضح ہو سکے کہ یہ کس طرح ہمیں حقائق سے دور لے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاتے ہیں۔ ایک مقدمہ یہ ہے کہ الفاظ حقیقی اور مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، یہ ایک مسلمہ ہے۔ اب اس حقیقی عمل پر ایک وہم استوار کیا گیا ہے کہ جب متکلم بات کرے گا تو سامع کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس نے حقیقی معنی میں الفاظ بولے ہیں کہ مجازی معنی میں! جب یہ معلوم نہیں ہوسکتا تو پہلا عقلی نتیجہ تو یہی نکلے گا کہ مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا۔ ایک طرف یہ عقلی تجزیہ ہے، تو دوسری طرف ہمارا لسانی تجربہ ہے۔ ذرا سوچیے کہ آیا واقعی ہمیں اپنی زندگیوں میں حقیقت و مجاز طے کرنے میں اتنی ہی مشکل پیش آتی ہے کہ مدعا عنقا ہو جائے۔ ان کے نزدیک، دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تعدد معنی وجود پذیر ہو جائے گا۔ کچھ الفاظ کو حقیقی معنی میں لے کر ایک معنی طے کر لیں گے تو کچھ مجازی معنی میں لے کر کچھ اور معنی۔ ''لائے ہیں بزم ناز سے یار خبر الگ الگ'' کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہاں بھی میں یہی عرض کروں گا کہ آیا ہمارا لسانی تجربہ اسی کی تصدیق کرتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ایک اور مقدمہ دیکھیے، الفاظ کے معنی لغات (dictionary) سے معلوم ہوتے ہیں، اور لغات کے مصنف ایک دو لوگ ہی ہوتے ہیں، لہٰذا ان لغات میں معنی آحاد نے ثبت کیے، اور یہ مسلمہ ہے کہ آحاد سے حاصل معلومات ظن کی حامل ہوتی ہیں۔ لہٰذا الفاظ کے معنی ظنی ذرائع سے معلوم ہوئے، تو واضح ہوا کہ کلام کا مدعا تمام کا تمام ظن ہوگا، اس لیے کہ اخبار آحاد سے تمام الفاظ کے معنی درج لغات ہوئے ہیں۔ اس مقدمے کو بھی ذرا حقیقت میں رکھ کر دیکھیں کہ کیا اہل زبان لفظوں کے معنی لغات نکال کر دیکھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح لغات کی حقیقت پر بھی غور کریں۔ مثلاً آم کے معنی لغت میں mango لکھے ہوئے ہیں اور کیا آپ کو اور مجھے صرف لغت ہی میں دیکھ کر معلوم ہوئے ہیں؟ اور کیا لغات میں لکھے ہوئے الفاظ صرف آحاد ہوتے ہیں، یا ان کو تواتر لسانی کی سند بھی حاصل ہوتی ہے؟ شاذ یا متروک الفاظ تو شاید ظنی کہلا سکتے ہیں، مگر وہ بھی اس وقت، جب وہ اس وقت لغت میں لکھے جائیں، جب وہ متروک ہو چکے ہوں۔ اگر وہ اپنے استعمال کے عہدِ تواتر میں ثبتِ کتب ہوئے ہوں تو یہ بھی ظنی نہیں ہوں گے۔ مثلاً اگر آج ہم 'آم' کے لفظ کو لغات میں ثبت کریں، اور پچاس سال بعد جب انگریزی کا mango اس کی جگہ لے چکا ہوگا اور آم متروک ہو چکا ہوگا تو آیا لغت میں لکھا ہوا اس کا معنی ظنی ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ یہ اور اس طرح کے مزید آٹھ توہمات ہیں، جن کی بنا پر ہمارے کلامی علما کلام کی دلالت کو ظنی مانتے رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی حیثیت عقلی فریب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

عقلی اوہام اور حقیقت واقعہ

اس عقلی وہم کو ایک عملی ظاہرے سے مدلل کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً قرآنی تفاسیر میں علما کے مابین اتفاق نہیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعدد معنی اور عدم قطعیت کا نظریہ عملی زندگی سے ثبوت بھی پاتا ہے۔ لہٰذا، ان کے خیال میں، ظنی الدلالت کا مسلک عقل اور حقیقت واقعہ، دونوں سے ثابت ہے۔ لیکن واضح رہے کہ حقیقت میں یوں نہیں ہے۔ اس مظہر سے دلیل پکڑنا دراصل اپنے عقلی توہمات کے اثر میں عجلت اور نہایت پست سہل پسندی (simplification) سے ایک مظہر کو سہواً ثبوت میں پیش کرنا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے کسی کی سبق لسانی کو آپ اپنے حق میں استعمال کرلیں یا پروف کی غلطی کو مصنف کی بے علمی پر قیاس کرلیں۔ میری بات کا مطلب یہ ہے کہ اس گروہ نے تفسیری اختلافات کو اپنے حق میں یہ جانے بغیر استعمال کرلیا کہ آیا وہ اختلافات لسانی بے مائیگیوں سے پیدا ہوئے تھے یا وہ تفاوت ہاے فکر کا شاخصانہ تھے؟ مثلاً اگر ایک معتزلی، اعتزال کی روشنی میں تاویلات کرنے کو جائز مانے، دوسرا تشیع کے فکری ڈھانچے کی بنیاد پر، تیسرا اشعریت کی سان پر آیات کو چڑھا دے، چوتھا شافعی اصولوں پر احکام کی تعبیر کرے اور پانچواں حنفی اصولوں پر تو اب جو تفسیری اختلاف ہوگا، وہ لسانی وجوہات سے نہیں، بلکہ فکری وجوہات سے ہوگا۔ ہمارا مکتب فکر اسی طرز پر تفسیر کرنے کو خارج کی روشنی میں تفسیر کرنا کہتا، اور اسے ناجائز قرار دیتا ہے۔

شاید یہی وہ چیز تھی جسے دیکھ کر اسلاف کے ہاں تفسیر بالرائے کو رد کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے تفسیر بالرائے کا جو متبادل فراہم کیا گیا، وہ خود آراہی کا مجموعہ تھا، یعنی مرویاتِ اسلاف۔ چنانچہ خارج کی ایک چیز کو چھوڑا تو دوسری کو پکڑ لیا گیا۔ ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ خارجی افکار و نظریات کی روشنی میں جب قرآن سمجھا جائے گا تو قرآن کی تفسیر میں یقیناً رائے داخل ہوگی، اور اختلاف پیدا ہوگا۔ دراصل ہونا یہ چاہیے کہ اپنی آرا و نظریات کو قرآن کی روشنی میں متعین کیا جائے، نہ کہ قرآن کو ان کے مطابق سمجھا جائے۔ مثلاً تفسیر کے عہد جدید کے آغاز میں معجزات اور سائنس کے ظاہری ٹکراؤ کے تحت 'لَا تَبۡدِيۡلَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ' کی تفسیر قرآنی سیاق وسباق سے کاٹ کر کی گئی۔ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ کے پیدا ہونے کا انکار کرنے کے لیے اسے قرآنی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ بچے ماں اور باپ کے باہمی تعامل سے پیدا ہوتے ہیں، تو اس سنت کی خلاف ورزی ولادت مسیح میں بھی نہیں ہوئی، اس لیے حضرت عیسیٰ (معاذ اللہ) یوسف نامی کسی شخص کے بیٹے تھے۔ یہ الفاظ پر خارج کی حکومت مان کر کی جانے والی تفسیر کی جدید مثال ہے۔ قرآنی الفاظ میں کوئی کمی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ تفسیر ممکن ہو۔

دورِ قدیم میں علم کلام کی روشنی میں کی گئی تفسیر، مثلاً: 'قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' کی تفسیر میں بوعلی سینا لکھتے ہیں: 'قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' میں 'هو' مطلق ہے جس کی 'هوية' دوسرے پر موقوف نہ ہو، کیونکہ جس کی 'هوية' غیر پر منحصر ہو، اسے 'هو' نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں بھی دیکھیے قرآنی الفاظ میں وہ کیا چیز ہے جو ایک عام ضمیر کو فلسفیانہ 'هوية' کا مفہوم دے

www.javedahmadghamidi.com

رہی ہے۔ سچی بات ہے کہ ایک چیز بھی نہیں ہے۔اسی طرح 'ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ' جیسا مشہور فقہی اختلاف فقہی فتوے کی بنا پر سیاق وسباق سے آیت کو کاٹ کر دیکھنے سے وجود میں آیا تھا۔لفظ کا مشترک المعنی ہونا اس کا حقیقی سبب نہیں ہے۔

یہ مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ ایک مثال میں 'ھو' کے معنی میں 'ھویة' کو گھسیڑنے کا امکان نہایت واضح طور پر موجود نہیں ہے، لیکن علم کلام سے دل چسپی رکھنے والے آرام سے کہہ دیں گے کہ تمھیں کیا معلوم کہ یہ کتنی شان دار تفسیر ہے۔اسی طرح سرسید کی 'سُنَّةُ اللّٰهِ' سے متعلق تفسیر پر بھی یہی کہا جائے گا۔فقہی اختلاف والے اپنے مسالک کی توجیہات میں لگے رہیں گے۔حقیقت یہ ہے کہ تینوں تفاسیر میں ایک بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کا باعث کلام میں موجود ہو۔اختلافی تفاسیر میں زیادہ تر کا سبب یہی خارجی آرا اور احوال ہیں۔کم ہی ایسی آیات ہوں گی، جہاں قرآن کی زبان احتمالات کا سبب بنی ہو۔فقہی آرا قیاس سے بنتی یا آحاد سے وجود پاتیں اور ان کی روشنی میں قرآن کو سمجھا گیا، علم کلام سے فکر تشکیل پایا، اور قرآن کی آیات کی اس فکر کے مطابق تاویل کی گئی۔اسی طرح باطنیت اور تصوف کے کیف و وجد اور وجودی فلسفے سے آیات کے معنی تبدیل کیے گئے۔لیکن طعن زبان پر ٹوٹا کہ وہ قطعی الدلالت نہیں ہے۔پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی اختلافی تفسیر آپ کو ملے گی کہ جس کی بنیاد خالصتاً لسانی ہو۔جتنے اختلافات ہیں، ان میں زیادہ تعداد ان مفسرات کی ہے جن کی وجہ خارجی اصول و آرا ہیں۔یعنی لسانی سطح پر احتمالات کی موجودگی اصلاً نہیں ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جدید عقلی توہمات

ہمارے اس نقطۂ نظر کہ کلام قطعی الدلالت ہوتا ہے، پر آج بھی جتنی تنقیدات ہوئی ہیں، وہ انھی افلاطونی طرز کے عقلی اوہام کے تحت ہوئی ہیں۔مثلاً لفظ شعور کی تخلیق ہے اور وہ اس پر حاکم ہے، اور شعور نمو پذیر ہے، اس لیے قطعیت ممکن نہیں ہے، کیونکہ قطعیت جمود (fixity) ہے، جب کہ لفظ کو نمو پذیر شعور کا ساتھ دینا چاہیے، اسے جمود زیبا نہیں ہے۔وغیرہ۔یہ میں نے ایک عقلی وہم بطور مثال اٹھایا ہے، ان اوہام کی تعداد کافی زیادہ ہے۔

یہ عقلی وہم آپ کو یاد دلائے گا کہ گھوڑے کے دانت مت گنو، گھوڑے کے دانتوں کی تعداد عقلی تک بندیوں سے جانو۔یہ بات پتا نہیں کہاں سے آ گئی کہ الفاظ اہل زبان کے شعور کی تخلیق ہیں۔ذرا بتائیے کہ چپاتی کے لیے روٹی کا لفظ میرے آپ کے شعور نے تخلیق کیا ہے یا ہم نے معاشرے سے بنا بنایا لیا ہے۔اول اول تو ہر لفظ کسی شعوری عمل یا حادثے سے وجود پذیر ہوا ہو گا، اس وقت ہو سکتا ہے کہ شعور نے اس پر حاکمیت رکھی ہو، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔اب یہ لفظ معاشرے نے مجھ آپ کو دیا ہے۔معاشرہ معلم ہے اور میرا آپ کا شعور اس کا متعلم، لہٰذا لفظ معاشرے کی وساطت سے ہمارے شعور پر حاکم ہوا۔[۳] اگر شعور کو آج بھی حاکم مانا جائے تو یہ تبھی ممکن ہے کہ ہم ہر روز نئے الفاظ

ایجاد کر رہے ہوں، یا ہر روز انھیں نئے معنی عطا کر رہے ہوں۔ اس صورت میں ایک نا قابل عمل صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً، کیا میں یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے شعور سے لفظ تخلیق کروں اور آپ کے سامنے بولوں تو آپ فوراً میرے شعور میں موجود اس کے معنی کو پا لیں گے؟ لفظ کسی زبان کا حصہ اس وقت بنتا ہے، جب اس کا چلن اہل زبان کے ہاں عام ہو جائے۔ جب لفظ اس مقام تک پہنچتا ہے، اس وقت معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ پھر شعور اس کا حاکم بننے کے بجائے اس کا محکوم بن جاتا ہے اور منبع بننے کے بجائے مورد بن جاتا ہے۔ لہٰذا عملی طور پر معاشرے کا لسانی چلن حاکم ہے، لیکن ان عقلی اوہام کے تحت شعور حاکم ہے۔ عملی طور پر تو شعور الفاظ سازی کے معاملے میں منفعل جگہ پر کھڑا ہے، مگر عقل کو وہم ہے کہ وہ فاعلی جگہ پر ہے۔ شعور اگر کچھ الفاظ کے معنی میں اضافہ وتغیر بھی کرتا ہے تو صرف اسی دائرے میں جس میں معاشرے کا چلن اجازت دے۔ مثلاً روٹی کو تو رزق کے معنی میں بول لیتے ہیں، لیکن چپاتی کو نہیں، الاّ یہ کہ چپاتی بھی معاشرے میں یہ مقام پا لے۔

اسی طرح دیکھیے کہ شعور کی نمو پذیری سے ظن پیدا ہوتا ہے، یہ اس اصول کا نتیجہ ہے جو افلاطونی فکر میں تھا کہ چونکہ کائنات متحرک ہے، اس لیے اس کا درست اور قطعی علم حاصل نہیں ہو سکتا، عالم مثال جامد و کامل ہے، اس کا صحیح علم ہم حاصل کر سکتے ہیں۔[۳] یہ عقلیتِ محض کا وہ استعمال ہے جسے میں نے عقلی تُک بندیوں کا نام دیا ہے، جس کا کوئی مقدمہ بھی ثابت شدہ نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہاں شعور محکوم ہے۔ اہل زبان نے لفظ کو جس معنی سے جوڑ دیا ہے، شعور اس کے آگے غلام کی طرح ہے۔ وہ اس کا پابند ہے، اگر وہ اس سے سر مو انحراف کرے گا تو بچے بھی اس پر ہنس پڑیں گے۔ ہمارے شعور کو معاشرے نے بالجبر پابند کیا ہے کہ 'روٹی' کا لفظ کس شے کے لیے بولنا ہے۔ شعور کو اس قابل ہونا ہے کہ وہ معاشرے میں موجود اس لفظ کے آگے جھکے، لفظ جو معنی معاشرے سے لے کر آ رہا ہے، اسے تسلیم کرے۔[۴] اسی طرح نمو پذیری کا لازمہ نقضِ قطعیت ہے، کوئی محکم بات نہیں ہے، محض عقلی وہم ہے۔ حقیقت یہ

۳؂ آپ کو یقیناً، عالم مثال کے بارے میں ارسطو اور افلاطون کی بحث یاد آ گئی ہوگی کہ افلاطون کے مطابق عالم مثال کی عقل میں موجود معلومات کی وجہ سے ہم چیزوں کو پہچانتے ہیں، اور ارسطو کے بقول باہر کی دنیا میں دیکھ کر ہم نے ان کی پہچان حاصل کی ہے۔ یہاں بھی یہی بحث ہے کہ آج ہماری زبانوں میں الفاظ شعور تخلیق کر رہا ہے یا معاشرے کا متواتر استعمال ذہن میں ڈال رہا ہے۔

۴؂ یہ خیال نہ کریں کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی متکلم ان الفاظ میں نیا مفہوم نہیں ڈال سکتا۔ ایسا ہر روز ہوتا ہے، لیکن واضح رہے کہ وہ اسی مفہوم کے ساتھ جڑا ہوتا ہے، جس مفہوم میں وہ لفظ معاشرے میں معلوم و معروف ہوتا ہے۔ نیا مفہوم معاشرے کی ماتحتی ہی میں سمجھ میں آتا ہے۔

ہے کہ ہم آج کئی متحرک اور نمو پذیر چیزوں کا نہایت گہرا علم رکھتے ہیں۔

عقلی فریب خوردگی میں یہ لوگ ایک تخیل اپنے گھر بیٹھے قائم کرتے ہیں، اور پھر اس کے نتائج فکر میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ عقلی خانہ زادی میں انھیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر حقیقتِ واقعہ کے خلاف بات کررہے ہیں، کیونکہ انھیں یہ زعم ہوتا ہے کہ ہم عقل عام نہیں، بلکہ بڑی محنت سے بنائی ہوئی عقل خاص سے باتوں کو سمجھ رہے ہیں۔ جس کی مثال یہ مقدمہ ہے کہ نمو پذیری قطعیت کی ناقض ہے۔ علم کی دنیا میں یہ نہایت کم زور بات ہوتی ہے کہ آپ خود ہی ایک خیال تراشیں اور آپ ہی اسے سچائی قرار دے دیں۔ اس سے پست کوئی عمل علمی دنیا میں وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔

افکار کا اثر فہم کلام پر

اوپر ہم نے مقدمہ قائم کیا ہے کہ فہم قرآن میں اختلافات کا اصل سبب خارجی اصول وافکار کے تحت قرآن کو سمجھنا ہے۔ افکار اور آرا کس طرح انسان پر غالب آتی ہیں، اور وہ کس طرح کلام کو سمجھنے سے انسان کو محروم کر دیتی ہیں، اس کو قرآن کے ایک مقام سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہم نے یوسف اور بن یامین علیہما السلام کا واقعہ سن رکھا ہے کہ حضرت یوسف نے اپنا ایک برتن بن یامین کے سامان میں رکھا اور پھر اعلان کرا دیا کہ میرا برتن چوری ہو گیا ہے اور تلاشی پر بن یامین کے سامان سے برآمد ہونے پر بن یامین ایک مجرم کی طرح روک لیے جاتے ہیں۔ جھوٹ اور ڈرامے پر مبنی اس سازش کا خالق (نعوذ باللہ) حضرت یوسف کو مانا جاتا ہے۔ اب میں قرآنی آیات آپ کے سامنے لاتا ہوں اور آپ کو واضح کرتا ہوں کہ قرآن کے الفاظ کیا کہہ رہے تھے، مگر اس کہانی کے اثر میں بڑے بڑے مفسرین کیا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ کہانی اتنا اثر رکھتی ہے کہ مفسرین قرآن کے الفاظ پر توجہ تک نہیں دے پاتے۔ آیات پر نظر ڈالیے، اور خط کشیدہ الفاظ کو ذرا توجہ سے نوٹ کرتے جائیے:

فَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِیۡ رَحۡلِ اَخِيۡهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الۡعِيۡرُ اِنَّكُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ. قَالُوۡا وَاَقۡبَلُوۡا عَلَيۡهِمۡ مَّاذَا تَفۡقِدُوۡنَ. قَالُوۡا نَفۡقِدُ صُوَاعَ الۡمَلِكِ وَلِمَنۡ جَآءَ بِهٖ حِمۡلُ بَعِيۡرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيۡمٌ. قَالُوۡا تَاللّٰهِ

’’جب اس نے ان کا سامان تیار کرایا تو ’سقایہ‘ اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک ہرکارہ بولا: او قافلے والو، (رکو) تم چور ہو۔ (برادران یوسف) ان کی طرف مڑ کر بولے: تمھاری کیا چیز کھوگئی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں بادشاہ کا ’صواع‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِي الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيۡنَ. قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ كٰذِبِيۡنَ. قَالُوۡا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِيۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجۡزِي الظّٰلِمِيۡنَ. فَبَدَاَ بِاَوۡعِيَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِيۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِيۡهِ كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِيُوۡسُفَ مَا كَانَ لِيَاۡخُذَ اَخَاهُ فِيۡ دِيۡنِ الۡمَلِكِ....

(یوسف ۱۲: ۷۰-۷۶)

نہیں مل رہا، جو وہ لوٹا دے گا، اس کو اونٹ بھر اناج دیا جائے گا، اور میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس کے جواب میں (برادران یوسف) بولے: باخدا، تم جانتے ہو کہ ہم اس علاقے میں فساد پیدا کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔ تو (محل کے کارندوں نے) کہا اگر تم جھوٹے ہوئے تو مجرم کی کیا سزا ہو گی؟ برادرانِ یوسف بولے: جس کے سامان سے 'صواع' نکل آیا، تو وہی شخص رکھ لیا جائے، ہم اپنے ہاں ایسے ظالموں کو یہی سزا دیتے ہیں۔ محل کے کارندے نے بن یامین سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان سے تلاش شروع کی، اور پھر تلاش کرتے کرتے بن یامین کے سامان سے 'سقایه'[۵] برآمد کر لیا۔ یوں ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، وگرنہ وہ شاہی قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں ٹھیرا سکتا تھا۔''

جب ہم مشہور کہانی کے زیر اثر ان آیات کو پڑھتے ہیں تو 'سقایه' (پینے کا پیالا آیت ۷۰) اور 'صواع' (اناج ماپنے کا برتن آیت ۷۲) کو ایک ہی سمجھ لیتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف نے کجاوے میں اپنا 'سقایه' رکھا تھا۔ دوسری طرف اتفاق سے بادشاہِ مصر کا پیمانہ (صواع الملك) چوری ہو جاتا ہے۔ پھر حضرت یوسف نہیں، بلکہ بادشاہ کا کوئی کارندہ آواز لگاتا ہے کہ رک جاؤ تم چور ہو، یہ کارندہ حضرت یوسف کے 'سقایه' کی نہیں، بلکہ بادشاہ کے چوری شدہ 'صواع' کی تلاش میں تھا۔ تلاش میں 'صواع' تو نہیں ملتا، البتہ حضرت یوسف کا 'سقایه' برآمد ہو جاتا ہے، اور بن یامین اس کی وجہ سے روک لیے جاتے ہیں۔ یعنی نہ حضرت یوسف نے 'سقایه' رکھ کر خود اعلان کیا اور نہ کوئی جھوٹ بولا۔ انھوں نے یقیناً اپنے بھائی کے سامان میں 'سقایه' محبت و اپنایت میں تحفہ کے لیے رکھا، مگر اللہ نے اس سے کچھ دوسرے مقاصد حاصل کر لیے، جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ 'كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِيُوۡسُفَ' (یوں ہم نے یوسف کے لیے ایک تدبیر کی)۔ بہرحال آیات میں 'صواع' اور 'سقایه' کے الفاظ موجود ہیں، لیکن

۵؎ قرآن میں یہاں لفظ 'سقایه' نہیں ہے، لیکن مؤنث ضمیر ہے: 'اسۡتَخۡرَجَهَا' (آیت ۷۶) جو 'سقایه' کی طرف راجع ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کہانی ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔کلام میں 'سقایه' کے لیے مؤنث ضمیریں آئی ہیں، مثلاً: 'اسْتَخْرَجَهَا' (آیت ۷۶) میں 'ھا'۔اور 'صواع' کے لیے مذکر ضمیریں آئی ہیں، مثلاً: 'مَنْ جَاءَ بِهِ'، میں 'ہ' کی مذکر ضمیر۔مراد یہ ہے کہ 'سقایة' اور 'صواع' کے الفاظ اوران کے لیے مختلف ضمیریں صرف اس لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں کہ ہم کہانی کے زیر اثر آیات کو پڑھتے رہے۔

بالکل اسی طرح ہمارے فلسفے، علم کلام، ہماری آرا اور ہمارے عہد کے تصورات، ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے آیات کے الفاظ اوران کے مصداقات ہم سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آیات کے علی الرغم ہم سیدنا یوسف پر تہمت باندھ دیتے ہیں کہ انھوں نے جھوٹ پر مبنی ایک چال چلی (نعوذ باللہ)۔اسی لیے ہم اس بات کے قائل ہیں کہ خارج سے اس نوع کی چیزیں فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ہم قرآن نہیں سمجھ رہے ہوتے، بلکہ اپنے فہم کو قرآن کے الفاظ میں ٹھونس رہے ہوتے ہیں۔استاذ گرامی کا جملہ کہ ہمارا مسلک یہ ہے کہ ''لفظ کو پکڑ کر چلیں''۔ یہ خارج کے انھی اثرات کی نفی کے لیے بولا جاتا ہے۔وہ اثرات جو 'سقایه' اور 'صواع' میں فرق مٹا دیں، مذکر و مؤنث ضمیروں کو بے معنی کر دیں، ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قرآن کے الفاظ، کلام کے دروبست اور سیاق وسباق کی حاکمیت کے آگے سر جھکا دیا جائے۔فلسفے اور داستانیں اثر انداز نہ ہونے دی جائیں۔

یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لسانی اعتبار سے قرآن نے وضاحتِ بیان کی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔دونوں برتنوں کے الگ الگ نام بتائے تھے، دونوں کے لیے الگ الگ ضمیریں لائی گئیں، 'صواع' کے مالک کا ذکر لفظ 'صُوَاعَ الْمَلِكِ' کے الفاظ سے کیا گیا تاکہ یوسف علیہ السلام کی طرف نسبت نہ ہو پائے۔گویا لسانی سطح پر کلام میں کوئی کمی نہیں تھی۔اب اگر کوئی کہے کہ تفسیر میں اختلاف لسانی بے مائیگیوں کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ عجلت میں کیا گیا محض غیر علمی تبصرہ ہے، جس کی جرأت صرف انھی کو ہوتی ہے جو فریبِ عقل کے تراشیدہ توہمات کی رو میں بہ جاتے ہیں، اور اس سے اٹھنے کی ہمت نہیں پاتے، کیونکہ ان کا کام حقائق سے ورے محض ذہنی کارستانیوں تک محدود ہوتا ہے، جس سے ان کی غلطی ان پر واضح ہی نہیں ہو پاتی۔وہ ارسطو کی طرح عقلی طور پر یہ مانتے رہتے ہیں کہ ماں کا ولادتِ اولاد میں بس اتنا ہی کردار ہے، جتنا زمین کا بیج کی کاشت میں۔لیکن وہ زمینی حقائق پر نگاہ ہی نہیں ڈالتے کہ بچے باپ پر بھی جاتے ہیں اور ماں پر بھی۔ماں سے بچوں کے نین نقش میں مشابہ ہونا یہ بتا رہا تھا کہ ماں کے خون سے بھی ان کو کوئی رشتہ ہے، ماں کا ان سے تعلق محض جائے استقرار کا نہیں۔

عقلیت کا حقائق سے بُعد

اہل فلسفہ کا حقائق سے بُعد اتنا ہی ہوتا ہے جتنا اس لطیفے سے واضح ہوتا ہے: ایک لڑکا فلسفہ و منطق پڑھنے گیا۔ واپس آیا تو ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ناشتے کے وقت ماں اس کا ناشتہ لائی اور پوچھا بیٹا یہ فلسفہ و منطق کیا ہوتا ہے، جو تو سیکھ کر آیا ہے؟

بیٹا بولا: ماں یہ بہت ہی مفید علم کا نام ہے۔

ماں بولی: مجھے بھی بتاؤ، اس علم کا فائدہ کیا ہے؟

اس نے کہا: ماں تو کیا جانے! یہ بہت بڑا علم ہے۔ دیکھ یہ انڈا جو تو ابال کر لائی ہے نا، یہ ایک ہے، میں اس علم کے زور سے اسے دو ثابت کر سکتا ہوں۔

ماں نے چہک کر کہا: ارے واہ، واقعی!

لڑکے نے نہایت چابک دستی سے باتیں بنائیں اور اپنے زعم میں ماں کو ثابت کر دیا کہ یہ ایک نہیں دو انڈے ہیں۔

ماں کو کچھ سمجھ آئی کچھ نہیں، تو تنگ آ کر بولی: اچھا ایسا کرتے ہیں یہ انڈا میں کھا لیتی ہوں اور جو تم نے ثابت کیا ہے وہ تم کھا لو!!

تمام rationalist فلسفے کی اصلاً یہی حقیقت ہے۔ باتوں ہی باتوں میں غیر موجود انڈے کو عقلی تُک بندیوں سے موجود مانتے رہنا۔ بلاشبہ، حقائق کی کچھ آمیزش ہوتی ہے۔ لیکن وحدت الوجود، عالم امثال وغیرہ، اسی طرح کے ذہنی تخلیقات کے بے بنیاد افسانوں کا نام ہے۔ لسانی فلسفے بھی اس عقلیتِ محض سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔

عقلیتِ محض ناقص ذریعۂ علم

زبان انسانی تجربے میں جس قدر قوت رکھتی ہے۔ یہ عقل پرستوں کے لیے شاید کوئی ذلت اور پستی کا عمل ہے کہ وہ اس تجربے کو فراموش کر کے محض عقلی تُک بندیوں تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔ عقلیتِ محض خالصتاً ایک ناقص ذریعۂ علم ہے۔ خدا نے ہمیں فطرت، وجدان، عقل اور حواس سب حصول علم کے لیے دیے ہیں۔ جس علمی منہج میں کسی ایک کی بھی کمی پائی جائے گی وہ دھوکے میں رہے گا۔ عقلیت پرستوں (rationalists)، سائنس دانوں (empiricists)، اور صوفیوں (mystics) کے اپنے اپنے طرز فکر اور منہج کا نقص ہی یہی ہے کہ انھوں نے صرف ایک ذریعۂ علم پر انحصار کیا ہے۔ میرے خیال میں فطرت، وجدان، عقل اور حواس ایک دوسرے کے لیے پڑتال کا کام کرتے ہیں۔

جب میری نگاہ غلطی کھاتی ہے، تو عقل اس کی اصلاح کر دیتی ہے، عقل چوکتی ہے تو فطرت راہنمائی کے لیے آ جاتی ہے۔ لیکن اگر ان کو نہ مانا جائے تو پڑتال کا یہ عمل رک جاتا ہے۔ اس لیے جب وجودی صوفیوں نے وجدانِ محض کو اپنایا تو گم راہ ہوئے، سائنس دانوں نے صرف حواس پر انحصار کیا تو ملحد ہوئے، فلسفیوں نے عقل کو ماخذِ کل مانا تو عقلی بُھول بُھلیوں میں کھو گئے۔ لسانیات میں بھی عقل کو ماخذِ کل ماننے والے فلسفیوں نے لسانی نظریات کی بنیاد رکھی تو یہاں بھی وہ بھول بھلیاں وجود میں آئی ہیں کہ اب ان کو راہ سجھائی نہیں دے رہی ہے۔

حقیقت واقعہ

زبان کا روزمرہ کا تجربہ، علوم کا قدیم وجدید کتب کے ذریعے سے تہذیبوں کو منتقل ہونا، اسکول وکالج کی تعلیم سے علوم کے ماہرین پیدا ہونا، اور ان سب کاموں میں زبان کا مرکزی ذریعۂ ابلاغ کی حیثیت رکھنا اس بات کا محکم ثبوت ہے کہ زبان پوری قطعیت سے بات کو آگے منتقل کرتی ہے۔ فہم قرآن کے اختلافات کا سبب علم وتدبر کی قلت کے ساتھ ساتھ افکار ونظریات کی سحر انگیزی بھی ہے، جو ہماری نگاہ کو سحر زدہ کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے ہم ـــــ قرائن، دروبست، اور سیاق وسباق تو ایک طرف ـــــ 'سقایة' اور 'صواع' ـــــ جیسے موٹے موٹے الفاظ تک سے چُوک جاتے ہیں۔ چنانچہ زبان کی تمام ترا بانتوں (univocal-signification) کے باوجود ہم صحیح مدعا نہیں پا سکتے۔ عقل فریبی کی وجہ سے حقائق واقعہ سے چوک جانے والے تفسیری اختلافات کے نقص کا طعن زبان پر توڑتے ہیں۔ حالاں کہ اصل سبب اختلاف زبان سے خارج میں پڑا ہوتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ڈاکٹر عرفان شہزاد

احمدیت کی اشاعت اور بنیادی استدلالات کا مختصر جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امت مسلمہ کی طرف سے احمدیت کی بھرپور مخالفت اور احمدیوں کے خلاف شدید پراپیگنڈا کے باوجود نہ صرف پاکستان، بلکہ پوری دنیا میں احمدی مذہب کے پیروکاروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ احمدیت کا بیانیہ مضبوط کرنے میں 'اہل ایمان' نے جو کردار ادا کیا، وہ ناقابل فراموش تو ہے ہی، ناقابل معافی بھی ہے۔ دین حق کے تحفظ کے نام پر انھوں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو باطل کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ عام مسلمانوں کو اس معاملے میں اتنا بھڑکایا گیا ہے کہ وہ دین کا دفاع کرتے کرتے ابوجہل، ابولہب، فرعون اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف پروہتوں جیسے کردار بن گئے ہیں، اور یہی احمدیت کے لیے تقویت کا باعث بنا ہے۔ دلیل کے مقابلے میں گالیاں، جوابی استدلال پیش کرنے کے بجائے تمسخر اور حقارت آمیز القابات سے پکارنا، ہمیشہ سے باطل کے علم برداروں کا وتیرہ تھا، قرآن کے آئینے میں دیکھیے کہ ایسا کون کرتا تھا:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ. اَتَوَاصَوْا	''اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اِن سے پہلوں کے پاس بھی جو رسول آیا، اُنھوں نے (اُس کو) یہی کہا کہ جادوگر

بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ. (الذاریات ۵۱: ۵۲-۵۳)

ہے یا دیوانہ۔ کیا یہ ایک دوسرے کو یہی وصیت کرتے رہے ہیں۔ (نہیں)، بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ!''

اپنی ملت میں واپس شامل کرانے کے لیے زور زبردستی اور ڈرانا دھمکانا قوم شعیب کا جہالت آمیز شیوہ تھا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ. (الاعراف ۷: ۸۸)

''اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیب، ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا، شعیب نے جواب دیا: کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا، خواہ ہم راضی نہ ہوں؟''

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی آیات اور ان سے پیدا ہونے والا تاثر کسی احمدی اور کسی متوقع احمدی، جس کی نظر دلائل کے بجائے محض رویوں پر ہو، کو احمدیت کے لیے قائل کرنے میں کتنا موثر ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی طرح سماجی مقاطعہ قریش کے کفار کا آئیڈیا تھا، یہ عہد جاہلیت کا ہتھکنڈا تھا، جسے آج مسلمانوں نے ''علی وجہ البصیرۃ'' اختیار کر رکھا ہے۔ اسی طرح دلیل کے مقابلے میں گھیراؤ، جلاؤ کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف ان پروہتوں کا ردعمل تھا جو دلیل کے میدان میں ان سے شکست کھا گئے تھے:

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۶۸)

''انھوں نے کہا: جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔''

عقیدے کی تبدیلی پر سرکاری پابندی لگانا فرعون کا کام تھا، اسے اصرار تھا کہ اس سے پوچھے بغیر کوئی اپنا عقیدہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا:

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ. (طٰہٰ ۲۰: ۷۱)

''فرعون نے (موسیٰ پر ایمان لے آنے والے جادوگروں سے) کہا: تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اس کی اجازت دیتا؟''

آج ہماری عدلیہ کا فیصلہ ہے کہ عقیدہ تبدیل کرنے سے پہلے مجاز اتھارٹی سے اجازت لینا پڑے گی۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مذہب تبدیل کرنے والے پر ارتداد کی سزا کا نفاذ کیا جائے۔ ہزاروں افراد نے نادرا کے ریکارڈ کے مطابق اپنا عقیدہ تبدیل کر کے احمدیت اختیار کی ہے۔ لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ احمدیت کے خلاف اتنی گالم گلوچ، نفرت، ظلم و جبر

اور سماجی مقاطعہ کے ہتھیار موثر کیوں نہ ہوئے، ہزاروں افراد نے احمدیت اختیار کیوں کی؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا جبر یہ ہتھکنڈے آج تک کسی بھی گروہ کو مٹانے میں موثر ہو سکے ہیں؟ کیا آپ کے پاس دلائل کا فقدان ہے کہ آپ کو جبر اور تشدد پر اترنا پڑا؟ کیا قانون سازی سے عقیدوں پر روک لگانا دلیل سے قائل کرنے کا متبادل ہوسکتا ہے؟ نظریات وعقائد کی تبدیلی قانون کی ہتھکڑیوں اور پراپیگنڈا کے شور سے روکی نہیں جا سکتی۔ کبھی مسلمانوں کا اخلاق دین کی ترویج میں معاون ہوا کرتا تھا، اب ان کا یہ انداز، دین کی تخریب میں سہولت کار بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو دلائل سے آراستہ کرنا کافی ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا ایک بنیادی فریضہ سماج سے جبر کا خاتمہ بتایا گیا ہے۔ جس کے لیے مسلم حکمران کو جنگ تک کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ. (الانفال ۸:۳۹)	’’(ایمان والو)، تم اِن سے برابر جنگ کیے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ، (یعنی دین میں جبر) باقی نہ رہے۔‘‘

الٹا، یہاں مسلمان ہی جبر کا علم بردار بن گیا ہے۔ کسی کے عقیدے پر اثر انداز ہونے کے لیے مسلمانوں کو جو لائحۂ عمل بتایا گیا ہے، وہ علم ودلیل کے ساتھ دعوت، نصیحت اور شایستہ مباحثہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ. (النحل ۱۶:۱۲۵)	’’اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمھارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔‘‘

مزید ستم ان اہل علم نے ڈھایا جنھوں نے قلم کو تلوار، دلیل کو ہتھیار اور مکالمہ کو مناظرہ بنا دیا۔ استدلال کے بجائے پراپیگنڈا کو وتیرہ بنا لیا گیا۔ انھیں احساس نہیں ہوا کہ آواز بلند کرنے سے دلیل مضبوط نہیں ہو جاتی، بلکہ مضبوط دلیل بھی بلند آہنگی میں بھانڈ کا بے سرا راگ بن جاتی ہے۔ اس روش سے دلیل اور دعوت سے بات کرنے والوں کی راہ مسدود ہوئی اور عام مسلمانوں کا مقدمہ کم زور ہوا۔

دلائل کے باوجود کوئی آپ کی بات سے قائل نہیں ہوتا، تو آپ کا کام ختم ہو گیا۔ زبردستی کسی کا عقیدہ تبدیل کرانا آپ کا کام نہیں۔ یہ اختیار تو خدا نے خود قدرت رکھنے کے باوجود استعمال نہیں کیا:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا. (الدھر۷۶:۳) ''ہم نے اُسے خیر وشر کی راہ سجھادی۔اب وہ چاہے شکر کرے یا کفر کرے۔''

دین کے قبول واختیار میں دین کا یہ اصل الاصول کیسے نظرانداز ہوگیا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. (البقرہ۲:۲۵۶) ''(یہ جوروبہ چاہیں،اختیار کریں)،دین کے معاملے میں (اللہ کی طرف سے) کوئی جبر نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہدایت (اِس قرآن کے بعداب) گم راہی سے بالکل الگ ہوچکی ہے۔''

اور یہاں لوگ انسان ہوکر یہ اختیار استعمال کرنا چاہ رہے ہیں! یہ فرعون کی روش ہے، یہ رسولوں کا اسوہ نہیں ،اور نہ ان کے پیروکار ایسا کرسکتے ہیں۔اپنی روش پرنظرثانی کیجیے،آپ کس کی راہ چل رہے ہیں؟

یہ امکان رد نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ لوگ مبینہ طور پر معاشی مفادات کی خاطر احمدی ہوجاتے ہوں گے، بیرون ملک سیاسی پناہ حاصل کرنا احمدیوں کے لیے سہل ہوتا ہے۔مگر اس پر بھی تو غور کیجیے کہ یہ ان کے لیے سہل کیوں ہوتا ہے؟ ملک میں احمدیوں کے لیے عدم تحفظ کی موجودہ صورت حال بھی تو عام مسلمانوں نے پیدا کر رکھی ہے،جس کی وجہ سے ان کے لیے بیرون ملک چلے جانا ایک بہتر انتخاب بن جاتا ہے۔

بہرحال،اس مضمون کے مخاطب وہ لوگ نہیں جو کسی لالچ میں احمدیت اختیار کرلیتے ہیں، ہمارے مخاطب احمدی اوراحمدیت اختیار کرنے والے سنجیدہ افراد ہیں۔احمدیت کے ساتھ مکالمہ کرنا ہی وہ واحد راستہ تھا جس سے جدا ہو جانے والے راستے واپس مل سکتے تھے۔

ہمارے ہاں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بنیادی استدلال کو طے کیے بغیر ہی تفصیلات میں پہنچ جاتے ہیں،جس سے بحث نتیجہ خیز ہونے کے بجائے بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ہم یہاں اپنی بحث احمدیت کے بنیادی استدلالات تک کو محدود رکھیں گے۔

خواب ومکاشفات

احمدیت سے متاثر سنجیدہ افراد سے مکالمہ اور مباحثہ کے بعد راقم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ان کے ہاں احمدیت کی طرف مائل ہونے کی بڑی اور موثر وجہ خواب اور مکاشفات ہیں جو جماعت احمدیہ میں شامل ہونے والوں کو بقول ان

کے ہوتے رہتے ہیں۔ ان مکاشفات کی ان کے ہاں بڑی اہمیت ہے۔ احمدیت، دراصل صوفیانہ مذہب ہے اور ہر صوفی فرقے یا حلقے کی طرح یہاں بھی خواب ہی عملی طور پر فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام تر دلائل کے بعد آخر میں احمدی حضرات کی طرف سے گویا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ ہمارے خواب کریں گے۔

خوابوں کا معاملہ چونکہ داخلی، ذاتی اور مابعدالطبیعاتی نوعیت کا ہوتا ہے، اس لیے یہ کبھی دوسرے کے لیے حجت نہیں بن سکتے۔ ان خوابوں اور مکاشفات کا معاملہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ دراصل نفسیاتی اور نفسانی کیفیات ہیں۔ نوجوانی کے ایک دور میں ہم پر بھی جب زہد وتقویٰ نے غلبہ پا لیا تھا تو اپنی مرضی کے خواب ہم بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ خواب میں ہم اپنی مرضی کی شخصیات سے اپنی مرضی کے فتوے بھی حاصل کرلیا کرتے تھے۔ خود کو ولی بھی محسوس کرتے تھے، مگر شعور کی پختگی کے ساتھ معلوم ہوا کہ یہ محض اپنے نفس کا واہمہ اور اپنی ہی خواہشات کی صداے بازگشت تھی۔

ہر مسلک اور فرقے کے لوگوں کو اپنے ہی مسلک اور فرقے کے اکابرین سے ملاقات وتائید ونصرت کے خواب آتے ہیں۔ عالم رؤیا میں سنیوں کو اہل تشیع کے اماموں سے کبھی فیض نہیں ملتا اور شیعوں کو غوث اعظم کی تائید کبھی حاصل نہیں ہوتی، یعنی عالم بالا میں بھی گویا مسلکی تعصب اپنا کام دکھاتا ہے یا یہ مرید اور سالکِ سلوک کے اپنے لاشعور یا تحت الشعور کی کارستانی ہے۔ یہ روحانی مکاشفات جب بھی دنیا سے متعلق ہوئے ہیں، ان کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ ماضی وحال کے کئی بزرگوں کے خواب ومکاشفات بالکل غلط نکلے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسان کے لیے کچھ روحانی یا نفسانی طاقتوں کا حصول، البتہ ممکن ہے جن سے کچھ عجیب وغریب کام لیے جا سکتے ہیں اور کسی حد تک درست پیشین گوئیاں کرنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ روحانی یا نفسانی طاقتیں ہر مذہب وملت کے نفسانی علوم کے ماہرین، بلکہ بعض اوقات عام افراد میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہندوؤں، بدھوں اور مسیحیوں میں تو یہ بہت عام ہیں۔ یہ دراصل روحانیت یا نفسانیت کی راہ سے بعض دنیوی امور میں تصرفات کرنے کی صلاحیت ہے، جیسے کہ ٹیلی پیتھی؛ حق و باطل کے فرق وامتیاز سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ معیار اگر یہی ہو تو آدمی کو سب سے پہلے ہندومت اور بدھ مت کو قبول کر لینا چاہیے یا پھر مسیحیت کو، نفسانی علوم کی اعلیٰ ترین مہارتیں ان تینوں مذاہب کے پیروکاروں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

پیراسائیکالوجی کے نیم سائنسی مضمون کے تحت یہ اب مستقل مطالعہ کا موضوع ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں ان روحانی یا نفسانی مظاہر کے قوانین انسانی ادراک میں آجائیں گے۔ اتنا بہرحال ہر ایک کے مشاہدے میں آتا

ہے کہ انسان کی چھٹی حس اسے پیش آنے والے کچھ واقعات کے بارے میں کبھی کبھی قبل از وقت آگاہ کرتی ہے۔اسی طرح بعض خواب بھی لوگوں کو آجاتے ہیں جو سچ ثابت ہوجاتے ہیں۔ایسے تجربات تقریباً ہر ایک کو پیش آتے ہیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ صلاحیت کسی شخص میں غیر معمولی حد تک موجود ہوسکتی ہے، مختلف روحانی یا نفسانی مشقوں سے اسے بڑھایا بھی جاسکتا ہے، یوں ایسے لوگ کافی حد تک درست پیشین گوئی کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی ہر بات درست نہیں ہوتی۔

انبیا کو ملنے والی وحی اور غیر انبیا کے خواب و مکاشفات میں کوئی مماثلت نہیں۔انبیا کی وحی کا قطعی اور متعین طور پر خدا کی طرف سے ہونا مصدقہ ہوتا ہے، یہ غیر مبہم ہوتی ہے، جب کہ عام لوگوں کے خواب و مکاشفات مبہم، ذو معنی اور ایک سے زیادہ تعبیرات و غیر متعین مصداقات رکھتے ہیں۔ان کی کچھ باتیں درست اور کچھ غلط ہوتی ہیں۔

اتنی بات بہر حال طے ہے کہ یہ خواب و مکاشفات حق و باطل کا معیار بننے کے لائق نہیں، ہر مذہب و مسلک نے ان غیر معمولی صلاحیتوں کو اپنی اپنی صداقت کے معیار کے طور پر پیش کیا ہے۔جس طرح کسی مذہب کا کوئی پیرو محض اس بنا پر سچا نہیں ہوسکتا کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے، اسی طرح کسی فرد کا غیر معمولی روحانی یا نفسانی طاقت کا حامل ہونا بھی اس کے دین و مذہب اور اکتشافی دعاوی کی صداقت کا معیار نہیں بن سکتا۔

خوابوں اور مکاشفوں کے بھروسے پر حق و ناحق ہونے کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔اس بنا پر راقم مرزا غلام احمد سمیت تمام صوفیا اور ان کے پیروکاروں کو جھوٹا نہیں سمجھتا، بلکہ خود فریبی یا غلط فہمی کا شکار سمجھتا ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

استقامت

احمدی حضرات کی طرف سے ان کی صداقت کی دوسری شہادت یہ پیش کی جاتی ہے کہ پاکستان میں خصوصاً اور دنیا بھر میں عموماً مسلمانوں کی طرف سے احمدیت کی شدید مخالفت، بلکہ جارحیت کے باوجود ان کی استقامت اور تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔احمدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی، بلکہ بعض جگہ غیر انسانی سلوک پر ہم نے ہر فورم پر بھرپور مذمت کی ہے، تاہم یہ چیز بھی معیار حق نہیں کہ مظلومیت اور اس پر اس گروہ کی استقامت ہمیشہ حق کا نشان ہی ہوتی ہے۔

ہر مظلوم اقلیتی گروہ میں ظلم کے خلاف ردعمل کی یہی نفسیات کارفرما ہوتی ہے اور ان میں ظلم کے مقابلے میں زیادہ مزاحمت اور استقامت پیدا ہوجاتی ہے، ان کی گروہی عصبیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔اس کی بے شمار مثالیں ہر مذہب و

ملت میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہی گروہ جب امن اور طاقت حاصل کر لیتے ہیں تو انھیں بھی آپس کے اختلاف اور افتراق کے وہی مسائل پیش آتے ہیں جو ہر گروہ کو اپنے ارتقائی مراحل میں پیش آتے ہیں، طاقت ملنے پر یہ بھی اپنے سے کم زور گروہوں کے ساتھ اس سے مختلف رویہ نہیں دکھا پاتے جس کے شکار وہ خود رہے ہوتے ہیں۔ اس کی نہایت جامع اور دل چسپ مثال یہود ہیں۔

بنی اسرائیل جب تک مصر میں ایک کم زور اقلیت کی حیثیت میں حالت غلامی اور جبر کا شکار رہے، پکے موحد اور متحد رہے، یہاں تک کہ خدا نے ان کی استقامت کی تعریف کی۔ لیکن جیسے ہی یہ سمندر پار کر گئے، ان کا دشمن نابود ہو گیا، تو بغیر کسی تاخیر کے انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایش کر ڈالی کہ ان کے لیے بھی بت بنایا جائے، جس کی وہ پوجا کریں۔ اس پر موسیٰ نے انھیں ڈانٹ پلائی۔ قرآن مجید میں ان کی اس استقامت اور اس انحراف کو ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے:

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ. وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ. وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ.

(الاعراف ۷: ۱۳۶-۱۳۸)

”سو ہم نے اُن (فرعونیوں) سے انتقام لیا اور اُنھیں سمندر میں غرق کر دیا، اِس لیے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے۔ اور اُن کو جو دبا کر رکھے گئے تھے، ہم نے اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔ بنی اسرائیل پر تیرے پروردگار کا وعدۂ خیر اِس طرح پورا ہوا، کیونکہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا سب کچھ برباد کر دیا جو وہ (اپنے شہروں میں) بناتے اور جو کچھ (دیہات کے باغوں اور کھیتوں میں ٹٹیوں پر) چڑھاتے تھے۔ (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر کے پار اتار دیا۔ پھر اُن کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو (اِس قدر احمق تھی کہ) اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ بنی اسرائیل نے (یہ دیکھا تو) کہا: اے موسیٰ، جس طرح اِن کے معبود ہیں، اُسی طرح کا ایک معبود ہمارے لیے بھی بنا دو۔ موسیٰ نے کہا: تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امن و مان پا لینے کے بعد ان یہود کے آپسی جھگڑے موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہی شروع ہو گئے۔ انھوں نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ گائے والا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آیا ہے۔ اسی طرح جب ان کے ایک اقلیتی گھرانے کے ایک فرد، طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کیا گیا تو انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ انھوں نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف سازشیں کیں، ان کے خلاف دشمنوں کی مدد کی، اسرائیل اور یہودیہ کی دو سلطنتیں بنا کر ایک دوسرے کے ساتھ جنگیں کیں، یعنی جب تک وہ بیرونی دشمن کے ظلم کے شکار رہے، وہ موحد بھی رہے اور متحد بھی، مگر امن پاتے ہی لڑنے جھگڑنے لگے، یہی نہیں، بلکہ تاریخ کے جس دور میں بھی یہ کسی بیرونی طاقت کے ظلم کا شکار ہوئے، یہ پھر موحد و متحد ہوتے رہے، یہاں تک کہ دور جدید میں دنیا بھر میں جب یہ ظلم کا شکار ہوئے تو متحد ہو کر انھوں نے اسرائیل جیسی ایک طاقت ور ریاست قائم کر لی۔

ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کی استقامت ان کے برحق ہونے کی نشانی ہے۔ دنیا بھر میں صدیوں تک ان کو مٹانے کی کوششیں ہوئیں، مگر وہ آج بھی قائم و دائم ہیں، بلکہ ترقی کر رہے ہیں۔ احمدی حضرات ابھی پہلے دور سے گزر رہے ہیں، اس لیے ان کی استقامت اور یک جہتی مثالی ہے، لیکن یہ حق کا معیار نہیں۔ اگر ہے تو یہود اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ انھیں برحق سمجھا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حقیقت یہ ہے کہ کسی گروہ کے حق و صداقت کی پرکھ محض علمی و عقلی دلائل کی بنا پر ہی کی جا سکتی ہے۔

اس مضمون میں ہم منطقی دلائل زیر بحث نہیں لائیں گے، منطقی دلائل جیسے اثبات کے لیے دیے جا سکتے ہیں، نفی کے لیے بھی دیے جا سکتے ہیں۔ عقیدے کے اثبات کے معاملے میں منطقی دلائل بنیادی طور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ علم الٰہی کا معاملہ ہے اور یہ علم الٰہی سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے، اور علم الٰہی جاننے کا قطعی اور ابدی ذریعہ قرآن مجید ہی ہے۔ ہم اس بحث میں روایات کو بھی اصلاً زیر بحث نہیں لائیں گے، کیونکہ دین کا ہر ایسا معاملہ قرآن کی بنیاد پر ہی طے ہونا ضروری ہے، اور یہ معاملہ تو ہے ہی عقیدے کا، اس لیے فیصلہ کن اتھارٹی قرآن مجید ہی ہے، روایات کو اس کے تابع رکھ کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

علمی دلائل

احمدیت کا بنیادی استدلال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی تسلسل نبوت کا ہے۔ دوسرا دعویٰ مرزا غلام احمد صاحب کے مسیح موعود ہونے کا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال نبوت کا اختتام

ہوا ہے، نہ کہ سلسلۂ نبوت کا۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، نہ کہ ان نبوت کا سلسلہ ختم کرنے والے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، آپ کے تابع، آپ سے کم تر درجے کے انبیا آتے رہیں گے جیسا کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے آتے رہے تھے۔ ان کے مطابق مرزا غلام احمد صاحب سے پہلے بھی صاحبان وحی اس امت میں گزرے ہیں، مگر مرزا صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے باقاعدہ اس کا دعویٰ بھی کیا اور اپنے نہ ماننے والوں کی تکفیر بھی کی، تاہم یہ تکفیر کسی مسلمان کو اسلام کے دائرے سے خارج نہیں کرتی، لیکن احمدیت کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے۔

نقد

ہم پہلے تسلسل نبوت کے تصور پر بات کرتے ہیں۔

احمدی حضرات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تسلسل نبوت کے ثبوت میں اثباتی دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور منفی دلائل بھی۔ نفی میں سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۰ میں 'خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ' کا مفہوم وہ افضل الانبیا اور کمال نبوت کا اختتام لیتے ہیں اور یوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی تسلسلِ نبوت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس تصور کے اثبات میں درج ذیل آیات پیش کرتے ہیں۔ ہم ایک ایک کر کے ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (الاعراف ۷: ۳۵)	''آدم کے بیٹو، (میں نے پہلے دن تمھیں بتا دیا تھا کہ) اگر تمھارے پاس خود تمھارے اندر سے پیغمبر آئیں، تم کو میری آیتیں سناتے ہوئے تو جو خدا سے ڈرے اور اُنھوں نے اپنی اصلاح کر لی تو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔''

احمدی حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں خدا تمام بنی آدم سے مخاطب ہو کر رسولوں کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔ چنانچہ جب تک بنی آدم دنیا میں موجود ہیں، رسول بھی آتے رہیں گے۔

اس آیت میں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہے کہ رسول آتے رہیں گے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر رسول آئے تو تمھارا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اگر یہ کہنا ہوتا ہے کہ رسول مسلسل آتے رہیں گے، تو اس کے لیے یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا۔ چنانچہ جب خدا نے قرآن میں خود اعلان کر دیا کہ اب اور رسول اور نبی نہیں آئیں گے تو

رسولوں کی آمد سے متعلق حکم بھی موقوف ہوگیا، جیسے ہر اس قوم کے لیے موقوف رہا جن پر کوئی نبی و رسول نہیں آیا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ اگر نماز کا وقت آ جائے تو نماز پڑھنا ہوگی، ورنہ گناہ گار ہو جاؤ گے۔ اب اگر نماز کا وقت ہی نہ آئے تو نماز نہ پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح نبی نہ آئے یا نبی کا آنا موقوف ہو جائے تو خدا کو اس آیت کے تحت اس کا پابند نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ کسی نبی کو بھیجنے کا امکان بنائے رکھے، جب کہ اس نے سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۰ میں واضح لفظوں میں اعلان بھی کر دیا ہو کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ (خاتم النبیین پر بحث آگے آئے گی)۔

۲۔ وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ. (آل عمران ۳:۸۱)

’’یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا: کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ اُنھوں نے کہا: ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا: اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔‘‘ (مودودی)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

احمدی حضرات اس آیت میں مذکور میثاق کو نبیوں سے لیا گیا میثاق قرار دیتے ہیں، جیسا کہ مولانا مودودی کے ترجمے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور پھر درج ذیل سورۂ احزاب کی آیت میں مذکور نبیوں کے میثاق سے اس کا تعلق جوڑتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی میثاق لیا گیا تھا کہ ان کے بعد بھی اگر کوئی رسول آئے تو وہ بھی اس کی تصدیق کریں گے، آیت یہ ہے:

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا. (الاحزاب ۳۳:۷)

’’اور یاد رکھو، جب ہم نے سب نبیوں سے اُن کا عہد لیا اور تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے اُن سے نہایت پختہ عہد لیا۔‘‘

یہ درست ہے کہ ’’میثاق النبیین‘‘ سے نبیوں سے میثاق کا مفہوم علما کے ایک طبقے نے سمجھا ہے، لیکن ہمارے

نزدیک یہ مفہوم لیتے ہوئے اس آیت کی تالیف اوراس کا سیاق وسباق نظر انداز ہوا ہے، جواس سے بالکل الگ مفہوم ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ پہلے یہ تعین کرنے کی ضرورت ہے کہ درج بالا سورۂ آل عمران کی آیت کے مخاطب کون ہیں؟اس کا تعین آیت کا سیاق وسباق بہت واضح طور پر کر دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَايُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ

''اوراہل کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگرتم مال و دولت کا ڈھیر اُن کے پاس امانت رکھ دوتو وہ تمھیں ادا کر دیں گے اور اِن میں وہ بھی ہیں کہ اگرتم ایک دینار بھی اُن کی امانت میں دے دوتو جب تک اُن کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، وہ اُس کو تمھیں ادا نہ کریں گے۔ یہ اِس وجہ سے کہ اُنھوں نے کہہ رکھا ہے کہ اِن امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ ہاں، کیوں نہیں؟ جو اُس کے عہد کو پورا کرے اور پرہیز گار رہے، (وہ اُسے محبوب ہے)، اِس لیے کہ اللہ پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔ (اِس کے برخلاف)، جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں، اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا اور نہ اُنھیں (گناہوں سے) پاک کرے گا، بلکہ وہاں اُن کے لیے ایک دردناک سزا ہے۔اور اِن میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اپنی زبان کو اِس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ تم سمجھو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں)، وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، دراں حالیکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، اور

www.javedahmadghamdi.com www.al-mawrid.org

اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ. فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ. اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ.

(آل عمران ۳: ۷۵-۸۳)

کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، دراں حالیکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا، اور (اِس طرح) جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ (پھر یہی نہیں، وہ اللہ کے پیغمبر پر بھی جھوٹ باندھتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ) کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اُس کو اپنی کتاب دے اور (اُس کے مطابق) فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور نبوت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کے بجاے تم میرے بندے بن جاؤ۔ (نہیں)، بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ لوگو)، اللہ والے بنو، اِس لیے کہ تم اللہ کی کتاب پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ اور نہ وہ تم سے یہ کہے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب بنا لو۔ تمھارے مسلمان ہو چکنے کے بعد کیا وہ تمھیں کفر اختیار کر لینے کی ترغیب دے گا؟ اور (اُنھیں یاد دلاؤ)، جب اللہ نے <u>نبیوں کے بارے میں</u> (اِن سے) عہد لیا کہ میں نے جو شریعت اور حکمت تمھیں عطا فرمائی ہے، پھر تمھارے پاس کوئی رسول اُس کی تصدیق کرتے ہوئے آئے جو تمھارے پاس موجود ہے تو تم اُس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اُس کی مدد کرو گے۔ (اِس کے بعد) پوچھا: کیا تم نے اقرار کیا اور اِس پر میرے عہد کی ذمہ داری اٹھالی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اقرار کیا تو فرمایا کہ پھر گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ (فرمایا کہ) پھر اِس کے بعد جو (اِس عہد سے) پھریں گے تو وہی نافرمان ہیں۔ تو کیا یہ لوگ (اب) اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش میں ہیں، دراں حالیکہ زمین

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اورآسمانوں میں طوعاًوکرہاً، سب اُسی کے فرماں بردار
ہیں اور اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔‘‘

خط کشیدہ الفاظ میں ہم نے دونوں طرح کے تراجم کے متعلقہ حصے برائے بحث لکھے ہیں جو مترجمین نے مراد لیے ہیں۔اس آیت کا سیاق سارے کا سارا بنی اسرائیل کومخاطب کررہا ہے۔ نیز میثاق النبیین کے بعداس میثاق کوتوڑنے کی صورت میں جولب ولہجہ اختیار کیا گیا کہ اگر انھوں نے اس عہد ـــــ کہ وہ ہر آنے والے رسول پر ایمان لائیں گے ـــــ کو پورا نہ کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو وہ فاسق کہلائیں گے، اور انھیں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ کیا وہ خدا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین بنالینا چاہتے ہیں۔کیا یہ اندازِ تخاطب انبیا کے لیے ہوسکتا ہے؟

میثاق النبیین سے جن مفسرین نے ’’نبیوں سے میثاق‘‘ سمجھا ہے، ہمارے نزدیک انھوں نے درست نہیں سمجھا۔ ’’ ’مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ‘ میں اضافت فاعل کی طرف نہیں، بلکہ مفعول کی طرف ہے۔یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیا سے میثاق لیا گیا، بلکہ یہ مطلب ہے کہ انبیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا‘‘ (تدبر قرآن)۔ہمارے نزدیک ان مفسرین کی بات درست ہے جو میثاق النبیین سے ’وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ الْمِیثَاقَ الَّذِی وَثَّقَهُ اللّٰهُ للأنبیاء علی أممهم‘، ’’جب اللہ نے وہ میثاق لیا جو اس نے انبیا کی امتوں سے ان کے انبیا کے لیے لیا‘‘ (التفسیر الکبیر ۸/ ۲۷۴) لیتے ہیں۔

اس مطالبہ کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ ہر نبی نے اپنی امت سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا تھا۔ چونکہ یہاں اس آیت کو لانے سے مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان کا مطالبہ ہے، نیز چونکہ انبیا کا بعثت محمدی کے وقت زندہ ہونا امکانات میں سے نہیں، اس لیے لامحالہ یہ مطالبہ انبیا کی اس امت سے ہے جو اس وقت موجود تھی، یعنی بنی اسرائیل سے۔ نیز آیت کا سیاق وسباق بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ مخاطب وہی ہیں، اس لیے میثاق النبیین کی درست تالیف وہی ہے جو ہم نے اپنے موقف کی تائید میں پیش کی۔

اس آیت کا سیاق سارے کا سارا بنی اسرائیل کو مخاطب کررہا ہے۔ نیز میثاق النبیین کے ذکر کے بعد اس میثاق کو توڑنے کی صورت میں جو لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے، وہ اندازِ تخاطب انبیا کے لیے یہاں موزوں نہیں، یعنی کہ اگر انھوں نے اس عہد ـــــ کہ وہ ہر آنے والے رسول پر ایمان لائیں گے ـــــ کو پورا نہ کیا تو وہ فاسق کہلائیں گے، اور یہ کہ کیا وہ خدا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین بنالینا چاہتے ہیں؟ ڈانٹ کا یہ انداز بنی اسرائیل کے لیے اختیار کیا گیا ہے جو

اس آیت کے سیاق میں بھی موجود ہے اور اسی موقع کی درج ذیل آیت سے بھی واضح ہوگا:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ. (المائدہ ۵:۱۲)

''اللہ نے (اسی طرح) بنی اسرائیل سے بھی عہد لیا تھا اور (اُس کی نگرانی کے لیے) ہم نے اُن میں سے بارہ نقیب اُن پر مقرر کیے تھے اور اللہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔ اگر تم نے نماز کا اہتمام کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں کو مانا اور اُن کی مدد کی اور اللہ، (اپنے پروردگار) کو قرض دیتے رہے، اچھا قرض تو یقین رکھو کہ میں تمھاری لغزشیں تم سے دور کر دوں گا اور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پھر اِس (عہد و میثاق) کے بعد بھی جو تم میں سے منکر ہوں تو (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس آیت میں دیکھا جا سکتا ہے کہ عہد بھی وہی ہے، لب و لہجہ بھی وہی، تنبیہ بھی ویسی ہی ہے اور مخاطبت بھی اہل کتاب سے ہے۔

چنانچہ اس آیت کا درست مفہوم ہمارے نزدیک یہ ہے:

''اور (اِنھیں یاد دلاؤ)، جب اللہ نے نبیوں کے بارے میں (اِن سے) عہد لیا کہ میں نے جو شریعت اور حکمت تمھیں عطا فرمائی ہے، پھر تمھارے پاس کوئی رسول اُس کی تصدیق کرتے ہوئے آئے جو تمھارے پاس موجود ہے تو تم اُس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اُس کی مدد کرو گے۔ (اِس کے بعد) پوچھا: کیا تم نے اقرار کیا اور اِس پر میرے عہد کی ذمہ داری اٹھا لی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اقرار کیا تو فرمایا کہ پھر گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔'' (البیان، غامدی)

اب سوال یہ ہے کہ سورۂ احزاب کی مذکورہ آیت میں 'انبیا کے میثاق' سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت بھی اس کے سیاق سے ہو جاتی ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ

''اور یاد رکھو، جب ہم نے سب نبیوں سے اُن کا

وَمِنۡ نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا. لِّيَسۡئَلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ وَاَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا. (الاحزاب ۳۳: ۷-۸)

عہد لیا اور تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے اُن سے نہایت پختہ عہد لیا (کہ ہمارا پیغام بے کم و کاست پہنچا دو)۔ تاکہ اللہ راست بازوں سے اُن کی راست بازی کے بارے میں سوال کرے (اور منکروں اور منافقوں سے اُن کے کفر و نفاق کے بارے میں)، اور منکروں کے لیے تو اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

اس آیت میں ’’تاکہ اللہ راست بازوں سے اُن کی راست بازی کے بارے میں سوال کرے‘‘ یہ طے کر رہا ہے کہ یہ میثاق انبیا سے اس بات کا عہد لیا گیا ہے کہ وہ ابلاغ میں کوئی کمی نہ چھوڑیں گے، یعنی اتمام حجت کریں گے اور اسی بنا پر کفار عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس بات کی وضاحت سورۂ مائدہ میں اس موقع کی آیات سے ہوتی ہے جہاں اس صورت حال میں سچوں کی سچائی پرکھنے کا مرحلہ درپیش دکھایا گیا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے اسی بات کا سوال کریں گے کہ کیا انھوں نے خدا کا پیغام بے کم و کاست پہنچا دیا تھا، اور پھر اسی بنا پر فرمائیں گے کہ آج سچوں کو ان کی سچائی کا صلہ ملے گا:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِحَقٍّ اِنۡ كُنۡتُ قُلۡتُهٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَهٗ تَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِىۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِكَ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ. مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِىۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ وَكُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ فِيۡهِمۡ فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِىۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ وَاَنۡتَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ. اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ

’’اور یاد کرو، جب (یہ باتیں یاد دلا کر) اللہ پوچھے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا تم مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو۔ وہ عرض کرے گا: سبحان اللہ، یہ کس طرح روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ کے علم میں ہوتی، (اِس لیے کہ) آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور آپ کے دل کی باتیں میں نہیں جانتا۔ تمام چھپی ہوئی باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔ میں نے تو اُن سے وہی بات کہی تھی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی پروردگار ہے

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (المائدہ۵: ۱۱۶-۱۱۹)

اور تمھارا بھی۔ میں اُن پر نگران رہا، جب تک میں اُن کے درمیان تھا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں۔ اب اگر آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ ہی زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔ اللہ فرمائے گا: یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کی سچائی اُن کے کام آئے گی۔ اُن کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ درج بالا آیت سے تسلسل نبوت کا استدلال درست نہیں۔

۳۔ درج ذیل آیت سے بھی تسلسل نبوت کا استدلال کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ. (الحج ۲۲: ۷۵)

''اللہ فرشتوں میں سے بھی (اپنے) پیغام بر چنتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ (اِس سے وہ خدائی میں شریک کیوں ہو جائیں گے)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ (خود) سمیع و بصیر ہے۔''

اس آیت کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھتے ہیں:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ. يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

''اللہ فرشتوں میں سے بھی (اپنے) پیغام بر چنتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ (اِس سے وہ خدائی میں شریک کیوں ہو جائیں گے)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ (خود) سمیع و بصیر ہے۔ اِن (فرشتوں) کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، وہ اُس سے واقف ہے اور تمام معاملات اُسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ایمان والو،

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

هُوَ اجۡتَبٰکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ هُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ هُوَ مَوۡلٰکُمۡ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ. (الحج ۲۲: ۷۷-۷۸)

(اِن کا عہد تمام ہوا، اب تمھارا دور شروع ہو رہا ہے تو) رکوع و سجود کرو اور اپنے پروردگار کی بندگی کرو اور نیکی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور (مزید یہ کہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے) اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو، جیسا کہ جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمھیں چن لیا ہے اور (جو) شریعت (تمھیں عطا فرمائی ہے، اُس) میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ تمھارے باپ — ابراہیم — کی ملت تمھارے لیے پسند فرمائی ہے۔ اُسی نے تمھارا نام مسلم رکھا تھا، اِس سے پہلے اور اِس (قرآن) میں بھی (تمھارا نام مسلم ہے)۔ اِس لیے (چن لیا ہے) کہ رسول تم پر (اِس دین کی) گواہی دے اور دنیا کے سب لوگوں پر تم (اِس کی) گواہی دینے والے بنو۔ سو نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمھارا مولیٰ ہے۔ سو کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آیت ۷۵ آگے آنے والی آیات کی تمہید ہے، جس میں ذریت ابراہیم میں سے بنی اسماعیل کے چنے جانے کا ذکر ہے، یعنی جس طرح اللہ افراد کو نبوت کے لیے منتخب کرتا ہے، اسی طرح اقوام کو بھی کار نبوت کی انجام دہی کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اس منصب کے لیے پہلے بنی اسرائیل کو چنا گیا، اور ان کے بعد اب بنی اسماعیل کو چنا گیا۔ یہ خدا کی طرف سے افراد و اقوام کے چنے جانے کا بیان ہے، نہ کہ تسلسل نبوت کا، یعنی خدا ایسا کرتا ہے، یہ نہیں کہ وہ ایسا کرتا بھی رہے گا۔ چنانچہ نبوت میں اس نے آخری دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چنا اور اقوام میں سے بنی اسماعیل کو۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اس نے بند کر دیا۔ اگر خدا اس کا تسلسل برقرار رکھتا تو قرآن میں بیان کر دیتا کہ وہ مزید کن افراد اور اقوام کو چننے کا ارادہ رکھتا ہے، جیسے قرآن سے پیشتر اس نے قدیم صحائف میں پیشین گوئیوں کی صورت میں پہلے سے یہ بیان کر دیا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی اسماعیل کو چنے گا۔ چنانچہ استثناء میں ہے:

''میں اُنکے لیے اُن ہی کے بھائیوں (یعنی بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اُسکے منہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُسے حکم دونگا وہی وہ اُن سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جنکو وہ میرا نام لیکر کہے گا نہ سُنے تو میں اُنکا حساب اُس سے لونگا۔'' (۱۸:۱۸-۱۹)

لیکن قرآن میں ایسے کسی فرد یا قوم کا ذکر نہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چنا جانا پیش نظر ہو، بلکہ وہاں نبوت کے سلسلے ہی کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

۴۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کوئی جھوٹا نبی زندہ نہیں بچ سکتا:

تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ. وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ. لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ بِالۡیَمِیۡنِ. ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ. (الحاقہ ۶۹: ۴۳-۴۶)

''یہ رب العلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (ہمارا) یہ (پیغمبر) اگر اپنی طرف سے کوئی بات ہم پر بنا لاتا۔ تو ہم اِس کو قوی ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ پھر اِس کی رگ گردن کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اِس کام سے روک نہ سکتا۔''

ہمارے نزدیک اس آیت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آپ کی صداقت اور دین کی باحفاظت منتقلی کی دلیل کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ جیسے کوئی سرکاری عہدے دار اگر اختیارات کا غلط استعمال کرے تو اس کی سزا بیان کی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی عامی ایسا ہی کام کر گزرے تو اس کو اس کے لحاظ سے جو سزا دینا ہوگی دی جائے گی، لیکن سرکاری عہدے دار کی سزا متعین طور پر بتائی جاتی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ دین کے ابلاغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی، نہ کہ یہ بتانا کہ کوئی اور بھی ایسا کرے گا تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ایسا ہوتا تو طرز بیان عمومی ہوتا۔ آیت مذکورہ میں بتایا جانے والا خصوصی انتظام دین کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے آپ کی اجتہادی آرا کی خطا پر اللہ کی طرف سے فوراً درستی کر دی جاتی تھی، لیکن آپ کے بعد مجتہدین کی خطاؤں پر خدا کی طرف سے کوئی اصلاح نہیں کی جاتی، کیونکہ بنیاد، یعنی دین محفوظ ہے۔

دین جب محفوظ طور پر منتقل ہو گیا تو اب اللہ کو دین کی حفاظت کے لیے مزید اس قسم کے انتظامات کی ضرورت نہیں کہ کسی جھوٹے نبی کو لازماً دنیا میں ہی عبرت ناک سزا دے۔ اب جس طرح اجتہادی معاملات عقل و دانش کی آزمایش کا میدان ہیں، اسی طرح یہ بھی آزمایش کا محل ہے کہ لوگ دین کے درست اور محفوظ ذریعۂ علم کے ہوتے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اپنے عقل وفہم کی بنیاد پر حق و باطل کی پہچان کریں۔ اس معاملے میں خدا کی محسوس مداخلت اب نہیں ہوگی، نہ اس کا خدا نے کوئی اعلان کر رکھا ہے۔

احمدی حضرات کی طرف سے چند اور آیات بھی تسلسل نبوت کے اثبات میں پیش کی جاتی ہیں، تاہم ہماری نظر میں یہی مقام قابل اعتنا تھے۔ باقی کے مقامات کا حال بھی یہی ہے کہ وہاں بھی تسلسل نبوت کا کوئی بیان نہیں دیا گیا ہے۔

ایک اہم بات

قرآن مجید میں ایمان لانے کا مطالبہ جہاں بھی کیا گیا ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیا اور آپ سے پہلے نازل کردہ وحی اور آپ اور آپ پر نازل کردہ وحی پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے۔ کسی ایک جگہ بھی، کسی آیندہ نبی یا آیندہ وحی پر ایمان لانے کا مطالبہ موجود نہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ کوئی نبی آنے والا تھا ہی نہیں۔ اب چونکہ اس میں کوئی ابہام نہیں تھا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس سمجھی ہوئی حقیقت کو سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے، حضرت زید کی مطلقہ، حضرت زینب سے آپ کے نکاح کی ضرورت کے ضمن میں بیان کیا (تفصیل آگے آتی ہے) اور یوں ختم نبوت کے مسئلے کو آخری درجے میں مبرہن کر دیا۔ یعنی فرض کیجیے کہ ختم نبوت کی آیت قرآن میں نہ بھی ہوتی، تب بھی آیندہ کسی نبی پر ایمان لانا ضروری تب ٹھیرتا کہ آیندہ انبیا کی آمد کا بیان موجود ہوتا، نہ صرف اس کا اعلان ہوتا، بلکہ ان پر ایمان لانا مطالباتِ ایمان میں شامل کیا جاتا، مزید برآں اس کے لیے با قاعدہ ذہن سازی کی جاتی، اس لیے کہ انبیا کا انکار کرنا عام رہا ہے، چنانچہ آنے والے انبیا کی نشانیاں ایسے ہی بتائی جاتیں جیسے گذشتہ انبیا کی آمد کی بشارتیں ان کی نشانیوں کے ساتھ گذشتہ آسمانی کتب میں بہ تکرار مذکور ہوا کرتی تھیں۔ محل غور یہ ہے کہ ان آنے والے انبیا میں سے بعض کی متعین نشانیاں، بلکہ نام تک بتائے جاتے تھے۔ جیسے یحییٰ علیہ السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں اور نام بتایا، اور عیسیٰ علیہ السلام نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں اور نام بتایا۔ گذشتہ صحف سماوی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ آنے والے انبیا کی نشانیاں بتا کر ان پر ایمان لانے کا عہد لیا جاتا تھا، قرآن مجید اس روایت سے یکسر خالی ہے۔

''جب حضرت مسیحؑ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اس وقت جیل میں تھے۔ انھوں نے وہیں سے حضرت مسیح علیہ السلام سے پچھوایا کہ ''وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟'' حضرت مسیح نے

جواب دلوایا کہ ''جا کے بتا دو کہ لنگڑے چل رہے ہیں اور اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کیا چاہیے!'' اس جواب کے بعد حضرت یحییٰ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا، وہ جس کی راہ صاف کرنے آئے تھے وہ آ گیا۔ حضرت یحییٰ کے بعد اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انھوں نے اپنے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی اور آپ کے نام نامی کی تصریح کے ساتھ بشارت دی۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے: 'وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰۃِ وَمُبَشِّرًا م بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ م بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ' (یاد کرو، جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تورات کی اُن پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں جو مجھ سے پہلے موجود ہیں، اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہو گا۔) (الصّف ۶۱:۶) اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے دعوت دی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو مجھ سے پہلے سے تورات میں موجود ہیں اور ایک رسول کی خوش خبری دیتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہو گا۔'' (تدبر قرآن ۶/۳۴۴)

لیکن قرآن ایسی کسی اثباتی دلیل سے بالکل خالی ہے۔ گذشتہ آسمانی صحائف میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بارے میں تو متعدد پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں، لیکن آپ کے بعد کسی نبی کے آنے کی پیشین گوئی سے وہ بھی خالی ہیں۔ یہ عدم ذکر درحقیقت اختتام نبوت کی بذات خود دلیل ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چنانچہ ہم سے جب بھی کسی نئے نبی کی نبوت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا تو پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ اس کی نبوت پر ایمان لانے کے لیے خدا نے ہمیں مکلّف کہاں کیا ہے؟ اس کی انفرادی نشانیاں کہاں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے جواب میں اگر عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کی روایات پیش کی جائیں، تو مرزا غلام احمد صاحب پر اس کی تطبیق کی مشکلات سے قطع نظر ہمارا اعتراض یہ ہے کہ اس معاملے کو قرآن مجید کے بجائے انفرادی روایات پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ قرآن مجید میں اس کا بیان کیوں نہیں آیا؟ قرآن مجید اگر قیامت کی نشانی کے طور پر یاجوج ماجوج کے آنے کی پیشین گوئی کر سکتا ہے تو عیسیٰ کا آنا تو ایک زیادہ مہتم بالشان معاملہ تھا، قرآن اس پر کیوں خاموش ہے؟ اس عظیم واقعہ سے قرون اولیٰ کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ اس بارے میں پائی جانے والی روایات محدثین کے اصول کے مطابق تواتر کے درجے کو بھی نہیں پہنچتیں، یعنی صحابہ کے دور میں ان کے درمیان اس کا کوئی چرچا نہ تھا۔

پھر ان روایات پر بہت سے اشکالات وارد ہوتے ہیں۔ اس میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ یہ روایات تمثیلی رنگ میں

ہیں۔ مسیح الدجال کی طرح مسیح بھی تمثیل ہے۔ یعنی دین کا کوئی خادم یا مسلمانوں کا کوئی صالح حکمران یا ان کی فکر ہوگی جس سے دین کی تجدید کا کام لیا جانا مقصود ہوگا۔ اسی کو مہدی بھی کہا گیا ہے۔ امام حسن بصری کے مطابق اس کا مصداق حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے، اور وہ گزر چکے۔ ان روایات میں جو تفصیل پیدا کی گئی ہے، وہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے حاصل ہوئی ہے، جو مسیح کی آمد اور ان کی بادشاہت کے قیام کے منتظر تھے۔ تاہم، یہ بشارت اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ خدا کی ابدی کتاب میں جگہ پاتی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، پروفیسر محمد عقیل کی کتاب، ''نزول مسیح کا تحقیقی مطالعہ'')

خاتم النبیین

قرآن مجید میں سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۰ اختتام نبوت پر ایک مزید محکم و قطعی دلیل ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ختم نبوت کا اعلان کرنے والی آیت قطعی اور محکم ہے، یعنی اس میں اختتام نبوت کے علاوہ کسی دوسرے ضمنی یا اضافی معنی کے احتمال کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس کو ہم ذیل میں ثابت کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا.

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

احمدی حضرات کے ترجمے میں بھی خاتم کو مہر ہی کے معنی میں لیا گیا ہے:

''نہ محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ تھے نہ ہیں (نہ ہوں گے) لیکن اللہ کے رسول ہیں بلکہ (اس سے بڑھ کر) نبیوں کی مہر ہیں اور اللہ ہر ایک چیز سے خوب آگاہ ہے۔'' (تفسیر صغیر ۵۵۱-۵۵۲)

قوسین میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیندہ کے لیے بھی کسی مرد کے باپ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ اس کی دلیل ان کی طرف سے یہ دی جاتی ہے کہ 'مَا کَانَ' کے الفاظ عربی زبان میں صرف یہی معنی نہیں دیتے کہ صرف اِس وقت باپ نہیں، بلکہ یہ معنی بھی دیتے ہیں کہ آیندہ بھی باپ نہیں ہوں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے 'کَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا' (النساء۴: ۱۵۸) یعنی اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم تھا، ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

آیت کی تشریح میں صاحب ''تفسیر صغیر'' لکھتے ہیں:

''ختم نبوت کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا مقام سب نبیوں سے افضل ہے۔''(۵۵۱)

پوری آیت کی تشریح احمدیت میں کچھ یوں کی جاتی ہے:

جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ حضرت زینب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا واقعہ پیش آیا تو لوگوں نے باتیں بنائیں کہ اپنے متبنیٰ کی مطلقہ سے شادی عرب کے رواج کے خلاف تھی، کیونکہ وہ اسے بھی حقیقی بہو کی طرح ہی سمجھتے تھے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جو سمجھتے ہو کہ زید (رضی اللہ عنہ) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ہیں، یہ غلط ہے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی بالغ جوان مرد کے باپ ہیں ہی نہیں اور صرف اِس وقت باپ نہیں، بلکہ آیندہ بھی کسی مرد کے باپ نہیں ہوں گے۔اس اعلان پر قدرتاً لوگوں کے دلوں پر ایک اور شبہ پیدا ہونا تھا کہ مکہ میں تو سورۂ کوثر کے ذریعے سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن تو اولاد نرینہ سے محروم رہیں گے، مگر آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) محروم نہیں رہیں گے، لیکن اب سالہا سال کے بعد مدینہ میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو کسی بالغ مرد کے باپ ہیں، نہ آیندہ ہوں گے، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ سورۂ کوثر والی پیشین گوئی (نعوذ باللہ) جھوٹی نکلی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مشکوک ہے۔اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ'، یعنی ہمارے اس اعلان سے لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے، باوجود اس اعلان کے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، بلکہ خاتم النبیین ہیں، یعنی نبیوں کی مہر ہیں۔ پچھلے نبیوں کے لیے بطور زینت کے ہیں اور آیندہ کوئی شخص نبوت کے مقام پر فائز نہیں ہوسکتا، جب تک کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مہر اس پر نہ لگی ہو۔ایسا شخص آپ کا روحانی بیٹا ہو گا اور ایک طرف سے ایسے روحانی بیٹوں کے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں پیدا ہونے سے اور دوسری طرف اکابر مکہ کی اولاد کے مسلمان ہو جانے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ سورۂ کوثر میں جو بتایا گیا تھا، وہ ٹھیک تھا۔ابوجہل، عاص اور ولید کی اولاد ختم کی جائے گی اور وہ اولاد اپنے آپ کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منسوب کردے گی اور آپ کی روحانی اولاد ہمیشہ جاری رہے گی اور قیامت تک ان میں ایسے مقام پر لوگ فائز ہوتے رہیں گے جس مقام پر کوئی عورت کبھی فائز نہیں ہوسکتی، یعنی نبوت کا مقام، جو صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے ـــــ پس اگر خاتم النبیین کے یہ معنی کیے جائیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور آیندہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، تو یہ آیت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور سیاق و سباق سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا اور کفار کا وہ اعتراض جس کا سورۂ کوثر میں ذکر کیا گیا ہے، پختہ ہو جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com

اس بیانیے میں درج ذیل نکات ہیں:

o 'کَانَ' کی خبر حال کے ساتھ مستقبل کے لیے بھی موثر ہے۔ ''تفسیر صغیر'' کے ترجمے میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

o 'لٰکِنْ' سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی ابوبیت کی نفی سے پیدا ہونے والے شبہ کہ اولاد نرینہ نہ ہونے کی بنا پر آپ کا نام لیوا کوئی نہ ہوگا، کو 'لٰکِنْ' کے بعد کے بیان سے دور کرنا ضروری ہے، چنانچہ یہ آپ کی روحانی اولاد کے مفہوم سے دور کیا گیا ہے جو آپ کے نام لیوا ہوں گے اور نبیوں کی شکل میں بھی آتے رہیں گے۔

o ان آنے والے نبیوں پر آپ کی مہر تصدیق لگی ہوگی۔ مہر تصدیق کے لیے نقش پیدا کرتی ہے، جس پر آپ کی نبوت کا پرتو ہوگا، وہ گویا آپ کی طرف سے تصدیق شدہ نبی ہوگا۔

o 'خَاتَم' کا لفظ مہر کے ساتھ زینت اور افضلیت کے اضافی مفاہیم بھی رکھتا ہے۔

o خاتم کے معنی اختتام کمال کے ہیں، نہ کہ مطلق اختتام کے، یعنی خاتم النبیین کا مفہوم کمال نبوت کا اختتام ہے، یعنی آپ جیسا کامل درجے کا کوئی نبی اب اور کوئی نہیں آئے گا، البتہ آپ سے کم تر درجے کے انبیا آ سکتے ہیں۔ اس پر دلیل خاتم الشعرا اور خاتم الاولیا جیسی تراکیب ہیں، جن میں 'خَاتَم' سے مراد آخری نہیں، بلکہ مجازی معنی کے اعتبار سے درجۂ کمال میں آخری فرد مراد ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نقد

پہلی بات تو یہ ہے کہ 'کَانَ' کی خبر میں دوام اور استقرار اس کا ایک پہلو ہے جسے ہر جگہ لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً 'کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً' ''لوگ ایک ہی امت تھے'' (البقرہ ۲: ۲۱۳)، تو کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی امت رہیں گے؟

دوام و استقرار کا معنی خبر کی خصوصیت کے سبب پیدا ہوتا ہے، نہ کہ 'کَانَ' کے فعل میں ایسی کوئی خصوصیت ہے۔ اس لیے ختم نبوت والی آیت 'مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ' سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیندہ بھی کسی مرد کے باپ نہ ہو سکیں گے، یہ وہم آیت کے الفاظ سے پیدا ہونا لازم نہیں جس کے تدارک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی باپ بنانے کا استدلال درست قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ اس آیت کے بعد آپ اگر کسی نرینہ اولاد کے باپ بن جاتے اور وہ بالغ ہو جاتی، تب بھی آیت کے بیان میں فرق نہیں پڑتا تھا، کیونکہ مسئلہ اس وقت زید کی مطلقہ سے آپ کے نکاح کا تھا اور اس وقت آپ بشمول زید کے کسی مرد کے باپ نہیں تھے اور

اسی بنا پر اس نکاح پر اعتراض کرنے والوں کو جواب دیا جا رہا تھا، یعنی یہ کہا جا رہا تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح پر لوگ کیوں معترض ہو رہے ہیں، آپ تو ان لوگوں میں سے کسی بھی مرد کے باپ نہیں ہیں؟ چنانچہ اس آیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ آپ مستقبل میں بھی کسی مرد کے باپ نہ ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کسی مرد کے باپ نہ ہوئے، لیکن اس واقعہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں رسول اللہ کی مردوں کے لیے ابوبت کی نفی کے ساتھ آپ کے ختم نبوت کا کیا تعلق ہے جو انھیں ایک ہی آیت میں انھیں مذکور کیا گیا؟ آیت کے ان مضمرات کو سمجھنے کے لیے آیت کا سیاق وسباق ہی کافی ہے۔ یہ آیت حضرت زید جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے، کی مطلقہ سے آپ کے نکاح کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے۔ یہ حکم اگرچہ پہلے نازل ہو چکا تھا کہ منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹے نہیں ہیں، جس کا صاف مطلب تھا کہ ان کی بیویاں بھی حقیقی بہوؤں کی طرح نہیں ہیں:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِيۡ جَوۡفِهٖ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓئِ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ ذٰلِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَهُوَ يَهۡدِي السَّبِيۡلَ. اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡٓا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِي الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَآ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا.

(الاحزاب ۳۳: ۴-۵)

''اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے ہیں (کہ ایک ہی وقت میں وہ دو متضاد باتوں کو مانتا رہے)۔ چنانچہ نہ اُس نے تمھاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو، تمھاری مائیں بنایا ہے اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا بنا دیا ہے۔ یہ سب تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، مگر اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ تم منہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ پھر اگر اُن کے باپوں کا تم کو پتا نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے حلیف ہیں۔ تم سے جو غلطی اِس معاملے میں ہوئی ہے، اُس کے لیے تو تم پر کوئی گرفت نہیں، لیکن تمھارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا، اُس پر ضرور گرفت ہے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔''

لیکن منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے منہ بولے باپ کا نکاح نہ کرنا، ایک سماجی رسم تھی، جو محض حکم دینے سے ختم

ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ثقافتی عادات اتنی آسانی سے نہیں بدلتیں۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند میں مسلم بیوہ کے نکاح ثانی کا رواج آج تک ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، حالاں کہ اس پر نہ صرف نص موجود ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی تمام امت کے سامنے ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ٹھیرا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے منہ بولے باپ کے نکاح کو درست نہ سمجھنے کی اس رسمِ باطل کی جڑ صرف حکم نازل کرنے سے نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے عملی طور پر ختم کر کے دکھا دی جائے۔ مسئلے کی نزاکت اور سماجی ردعمل کا عالم دیکھیے کہ قرآن مجید کی آیت کے ہوتے ہوئے کہ منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹے نہیں ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نکاح پر لوگوں کی طرف سے باتیں بنانے کی پریشانی لاحق تھی، جس پر اللہ نے آپ کو سمجھایا کہ آپ سے پہلے ہم دیگر رسولوں سے بھی ایسی خدمات لے چکے ہیں تو آپ کو بھی لوگوں کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے، جیسے گذشتہ رسول اللہ سے ڈرتے تھے۔ آیات ملاحظہ کیجیے:

وَاِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَتَخۡشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا. مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا. الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخۡشَوۡنَہٗ وَلَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا. مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا. (الاحزاب ۳۳: ۳۷-۴۰)

”(اِنھوں نے یہ فتنہ اُس وقت اٹھایا)، جب تم اُس شخص سے بار بار کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالاں کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو۔ پھر جب زید نے اپنا رشتہ بیوی سے منقطع کر لیا تو ہم نے اُس کو تم سے بیاہ دیا تا کہ مسلمانوں پر اُن کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ اپنا رشتہ اُن سے منقطع کر لیں۔ اور خدا کا حکم تو ہو کر ہی رہنا تھا۔ نبی کے لیے جو بات اللہ نے ٹھیرا دی ہو، اُس میں اُس پر کوئی تنگی نہیں ہے۔ (اُس کے پیغمبر) جو پہلے گزرے ہیں، اُن کے معاملے میں بھی اللہ کی یہی سنت رہی ہے اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے وہ جو اللہ کے پیغام پہنچاتے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے اور اُسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے
نہیں ڈرتے تھے۔ (لہٰذا تم بھی اُسی سے ڈرو، اے
پیغمبر، اور مطمئن رہو کہ) حساب کے لیے اللہ کافی ہے
(حقیقت یہ ہے کہ) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی
کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین
ہیں۔ (اِس لیے یہ ذمہ داری اُنھی کو پوری کرنی تھی)،
اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اس تناظر میں آیت کے مضمرات یوں کھلتے ہیں:

(حقیقت یہ ہے کہ) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (تو متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح پر اعتراض کرنے والے کس بنیاد پر اعتراض کر رہے ہیں) بلکہ آپ (تو) اللہ کے رسول ہیں (اور خدا کے رسولوں سے تو ایسے کام لیے ہی جاتے ہیں، جیسے کہ اوپر آیات میں بتایا گیا) اور (چونکہ آپ) خاتم النبیین (یعنی آخری نبی) ہیں۔ (اِس لیے یہ ذمہ داری آپ ہی کو پوری کرنی تھی، کسی اور نبی نے آنا ہوتا تو یہ کام اس کے لیے موخر کیا بھی جا سکتا تھا، مگر یہاں یہ امکان بھی نہیں)، اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

آیت زیر بحث میں ابوبیت کی نفی سے محض ابوبیت کی نفی نہیں، بلکہ اس اعتراض کی نفی مقصود تھی جو مخالفین اس نکاح پر اٹھا رہے تھے۔ حرفِ استدراک 'لٰکِنْ' لانے کا مقصد یہ وہم دور کرنا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کام کیوں لیا گیا۔ اس کا جواب یوں دیا گیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اس حیثیت سے ایسی اصلاحات کرنا رسولوں کی سنت رہی ہے، بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ آپ آخری نبی تھے، اس لیے اس رسم باطل کی جڑ آپ ہی کے ہاتھوں سے کٹنا ضروری تھا۔

خاتَم کا مفہوم

'خاتَم' کے لفظ میں زینت یا افضلیت یا کمال درجہ کا اختتام کا اضافی معنی پیدا کرنے کی از خود کوئی گنجایش نہیں۔ خاتَم کا معنی انگوٹھی یا مہر ہے، انگوٹھی کو بھی مہر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اس لیے یہ ایک ہی لفظ دونوں کے لیے مستعمل ہو گیا، یعنی خاتَم کا اصل مطلب مہر ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں زینت کا مفہوم آپ سے آپ شامل نہیں، جب تک زینت کے لیے الگ لفظ نہ لایا جائے جو خاتَم کو موصوف قرار دے کر اس کی صفت بنے۔ جیسے 'کتاب'

کہہ دینے سے کوئی کتاب دل چسپ کتاب نہیں بن جاتی، جب تک اس کے دل چسپ ہونے کا مفہوم دینے والا لفظ بطور صفت ساتھ موجود نہ ہو، اسی طرح محض مہر کہنے سے مہر کی زینت بیان نہیں ہو جاتی، جب تک اس کی زینت بیان کرنے کے لیے کوئی دوسرا لفظ ساتھ موجود نہ ہو، یا کوئی واضح قرینہ ہو جیسے خاتم الملک، یعنی بادشاہ کی انگوٹھی۔ مہر کے لیے تو زینت کا مفہوم موزوں بھی نہیں، یہ انگوٹھی کے لیے ہی موزوں ہو سکتا تھا، لیکن سیاق وسباق کے لحاظ سے یہاں انگوٹھی کا مفہوم کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ بشمول احمدی حضرات کے کسی نے بھی اس کا مفہوم انگوٹھی نہیں لیا، یعنی یہ کہنے کا کوئی محل نہیں کہ رسول نبیوں کی انگوٹھی ہیں، اور اس کا مزین ہونا بھی بیان میں نہیں آیا۔ اس لیے بالاتفاق 'خَاتَم' سے یہاں مہر کے معنی ہی لیے جا سکتے ہیں جس میں زینت کا کوئی مفہوم شامل نہیں۔ نیز اسی بنا پر 'مہر' کے لفظ میں افضلیت کا بھی کوئی مفہوم شامل نہیں۔ افضلیت کا مفہوم زینت ہی کے مفہوم سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب زینت کا مفہوم یہاں مفقود ہے تو افضلیت کا مفہوم بھی موجود نہیں ہے۔

خاتَم میں کمال درجہ کے اختتام کا بھی کوئی مفہوم خاتم میں پایا نہیں جاتا۔ یہ مفہوم پیدا کرنے کے لیے جو استدلال کیا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت بھی دیکھ لیجیے:

یہ غلط فہمی خاتم الشعرا اور خاتم الاولیا جیسی تراکیب سے پیدا ہوئی ہے۔ استدلال یہ کیا گیا ہے کہ خاتم الشعرا یا خاتم الاولیا کا مفہوم آخری شاعر یا آخری ولی نہیں ہوتا، بلکہ صاحب خطاب کے کمال پر دلالت کا یہ مجازی اسلوب ہے کہ اس جیسا با کمال شاعر یا ولی دوبارہ نہیں آئے گا، لیکن اس سے کم تر درجے کے لوگ آ سکتے ہیں۔ اس استدلال میں غلطی یہ ہوئی ہے کہ یہ ترکیب 'ت' کے کسرہ، یعنی زیر کے ساتھ مستعمل ہے، فتح، یعنی زبر کے ساتھ نہیں۔ یعنی خاتِم الشعرا یا خاتِم الاولیا ہے، نہ کہ خاتَم الشعرا اور خَاتَم الاولیا۔ کلام عرب میں یہ ترکیب کمال درجہ کے اختتام کے مفہوم میں لفظ 'خَاتَم' کے ساتھ مستعمل نہیں، جب کہ قرآن مجید نے لفظ 'خَاتَم' استعمال کیا ہے۔

میری بساط بھر تلاش و تحقیق کے بعد معلوم یہ ہوا ہے کہ تائے مکسورہ کے ساتھ خاتِم الشعرا جیسی تراکیب جو کمال درجہ کے اختتام پر دلالت کرتی ہیں، زمانۂ جاہلیت کے کلام عرب کے اسالیب میں موجود نہیں، اس کا سب سے پہلے استعمال ابوبکر الصولی (وفات ۳۳۵ھ) کی کتب میں ملا ہے جو چوتھی صدی ہجری کا ادیب ہے۔ اس نے اس ترکیب کو کچھ یوں برتا ہے:

وفلان خاتم القوم وخاتمتهم أي آخرهم. ''فلاں خاتم القوم ہے، یعنی ان کا آخری آدمی۔''

(أدب الكتاب للصولی ۱۴۰)

یہاں خاتم پر کوئی اعراب نہیں، تاہم، 'خاتمتھم' سے یہاں خاتم کی 'ت' پر کسرہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ اگر بفتح 'ت' بھی ہو تو معنی یہاں بھی مصنف نے آخری آدمی ہی مراد لیا ہے، نہ کہ کمال درجے کا آخری آدمی۔ اسی مصنف کے ہاں یہ ترکیب صرف ایک جگہ پر خاتم کی 'ت' پر فتح کے ساتھ بھی استعمال ہوئی ہے۔ اور پورے کلام عرب سے فقط یہ ایک ہی شعر ہے جو خاتم بفتح 'ت' بمعنی اختتام کمال کے مفہوم میں احمدی حضرات کی طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے:

فُجِعَ القَريضُ بخاتَمِ الشُّعراءِ ...

وغَديرِ رَوْضَتِهَا حَبيبِ الطّائي

(كتاب في أخبار أبي تمام. ألفه الصولي) أخبار أبي تمام (ص:۴۳)

یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید پر کلامِ عرب سے کوئی استشہاد پیش کرنے کا اصول یہ ہے کہ وہ قرآن مجید سے پہلے موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ ترکیب اول تو ایجاد ہی قرآن کے بعد کے دور کی ہے، دوسرے یہ کہ یہ خاتم کی 'ت' کے کسرہ کے ساتھ مستعمل ہے، جب کہ قرآن میں یہ تاے مفتوحہ کے ساتھ آئی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ابوبکر الصولی کے کلام میں اگر یہ تاے مفتوحہ کے ساتھ پائی گئی ہے تو اس میں دو احتمالات ہیں: ایک یہ کہ یہ کاتب کی خطا ہو سکتی ہے، شاعر نے اسے تاے مکسورہ کے ساتھ ہی برتا ہوگا، دوسرے یہ کہ شاعر نے تاے مفتوحہ کے ساتھ اس کا یہ استعمال قرآن سے متاثر ہو کر کیا ہے۔ مزید یہ کہ تاے مفتوحہ کے ساتھ یہ ترکیب رواج بھی نہیں پا سکی۔ رواج پا بھی جاتی تو بھی قرآن مجید کے بعد کے دور کی ہونے کی بنا پر یہ اس پر استشہاد نہیں بن سکتی تھی۔

اسی طرح پورے ذخیرۂ حدیث میں صرف ایک روایت ہے جس میں خاتم بفتح 'ت' کو اس معنی میں پیش کیا جاتا ہے کہ آخری سے حقیقی آخری مراد نہیں، بلکہ مجازاً کمال درجے کا آخری فرد مراد ہے۔ اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خاتم المہاجرین کہا تھا۔ احمدی حضرات کے مطابق اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے بعد کوئی اور مہاجر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ ترکیب 'افضل المہاجرین' کے معنی میں آئی ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوسَى بْنِ شَيْبَةَ الْأَنْصَارِيُّ السُّلَمِيُّ، قثنا إِسْمَاعِيلُ بْنُ قَيْسٍ، عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ: لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَدْرٍ وَمَعَهُ عَمُّهُ الْعَبَّاسُ، قَالَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، لَوْ

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر سے واپس تشریف لائے تو آپ کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول اگر آپ مجھے مکہ جانے کی اجازت دیں تو میں وہاں سے ہجرت کر کے آؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا، اطمینان رکھیے۔ آپ ہجرت کرنے

أَذِنتَ لِي فَخَرَجتُ إِلَى مَكَّةَ فَهَاجَرتُ مِنهَا، أَوْ قَالَ: فَأُهَاجِرُ مِنهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ: "يَا عَمِّ اطمَئِنَّ، فَإِنَّكَ خَاتَمُ الْمُهَاجِرِينَ فِي الْهِجرَةِ، كَمَا أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ فِي النُّبُوَّةِ".

(فضائل الصحابۃ، احمد بن حنبل ۹۴۱/۲)

میں خاتم المہاجرین ہیں جیسے میں نبوت میں خاتم النبیین ہوں۔"

سند کے لحاظ سے یہ ایک منفرد روایت ہے، یعنی یہ فقط ایک ہی سند سے منقول ہے۔ سند سے قطع نظر، کلام عرب کے معیار سے اس کا متن قابل قبول ہے تو یہ روایت دراصل اُس ہجرت کے خاتمے کا اعلان کر رہی ہے جس کا کرنا اس وقت کے مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا تھا۔ حضرت عباس فتح مکہ سے کچھ ہی وقت پہلے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اس کے فوراً بعد ہی مکہ فتح ہوا اور لازمی ہجرت کا حکم ختم ہو گیا۔ گویا حضرت عباس آخری مہاجر تھے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی۔ چنانچہ اس روایت سے بھی اختتام سے حقیقی اختتام کا مطلب ہی واضح ہوتا ہے، نہ کہ افضل المہاجرین کا۔

عقلی طور پر بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ وہ لوگ جنھوں نے اسلام کے شروع کے مشکل دور میں اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈال کر ہجرت کی، ان کی ہجرت سے اس آخری دور کی ہجرت کو افضل قرار دے دیا جائے، جب کہ حالات مسلمانوں کے حق میں پلٹ چکے تھے۔

اسی ضمن میں صوفیانہ حلقوں میں مشہور ایک اور روایت بھی پیش کی جاتی ہے جس میں حضرت علی کو خاتم الاولیا کہا گیا ہے:

أنا خاتم النبین و أنت یا علي، خاتم الأولیاء.

"میں خاتم النبیین ہوں اور تم، اے علی، خاتم الاولیا ہو۔"

یہ روایت موضوع ہے۔ گھڑنے والے نے نہ صرف یہ روایت گھڑی، بلکہ اولیا کو صوفیا کے خاص مفہوم میں بھی گھڑا، حالاں کہ یہ درحقیقت اس مفہوم میں ہندوستان کی اختیار کردہ اصطلاح ہے، جو کلام عرب کے لیے اجنبی ہے۔

خاتم النبیین کا مطلب

خاتم، یعنی مہر کے دو مفاہیم پیش کیے جا سکتے ہیں، یعنی seal یعنی مہر بند اور stamp۔ یعنی اس کا ایک معنی یہ ہو سکتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے سلسلے کے لیے مہر بند ہیں، اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا، سیاق و سباق کے لحاظ سے یہی مفہوم درست ہے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نبیوں کے تصدیق کرنے والے ہیں۔ احمدی حضرات کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہر، مہر لگانے کے عمل میں نقش پیدا کرتی ہے جو تصدیق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اب جس شخص پر نبوت محمدی کا نقش ہوگا، وہ بھی نبی ہوگا۔ آیت کے سیاق وسباق میں یہ مفہوم موزوں نہیں۔ تاہم بر سبیل تنزل اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ تو واضح ہے کہ گذشتہ انبیا آپ کی تصدیق سے ہی ہمارے لیے نبی قرار پائے ہیں، اور بالفرض اگر کوئی آیندہ انبیا ہوتے تو وہ بھی آپ کی تصدیق سے نبی مانے جاتے۔ گذشتہ انبیا کا معاملہ تو واضح ہے، لیکن اب آیندہ کوئی نبی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لیے کوئی تصدیق کہاں سے لاسکتا ہے؟ رسول اللہ کی طرف سے قرآن یا کسی کثیر الروایہ حدیث میں کسی نئے رسول کی تصدیق ثابت نہیں ہے۔ آنے والے انبیا کی کوئی نشانیاں نہیں بتائی گئیں۔ تسلسل نبوت کا نظریہ اگر درست ہوتو ہر آنے والے نبی کی خصوصیات کا بیان محمد رسول اللہ سے ثابت ہونا ضروری ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ''اپنے بعد آنے والے کسی نبی کی نہ آپ نے بشارت دی ہے، نہ تصدیق فرمائی ہے، بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اعلان کیا ہے کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے یہ بات بھی آپ نے واضح کر دی ہے کہ نبوت کا منصب ہی ختم نہیں ہوا، اُس کی حقیقت بھی ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اب کسی شخص کے لیے نہ وحی و الہام کا امکان ہے اور نہ مخاطبہ و مکاشفہ کا۔ ختم نبوت کے بعد اِس طرح کی سب چیزیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہیں۔

آپ کے ارشادات درج ذیل ہیں:

''۱۔ كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء، كلما هلك نبي خلفه نبي، وإنه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء. (بخاری، رقم ۳۴۵۵)

''بنی اسرائیل کی قیادت اُن کے نبی کرتے تھے۔ ایک نبی دنیا سے رخصت ہوتا تو دوسرا اُس کا جانشین بن جاتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ خلفا ہوں گے۔''

۲۔ إن مثلي و مثل الأنبياء من قبلي كمثل رجل بنى بيتاً فأحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاوية، فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له و يقولون: هلا وضعت هذه اللبنة؟ قال: فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين. (بخاری، رقم ۳۵۳۵)

''میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے نبیوں کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی، نہایت حسین و جمیل، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اُس عمارت کے گرد پھرتے اور اُس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی؟ فرمایا کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔''' (میزان، جاوید احمد غامدی ۱۴۹-۱۵۰)

ہمارے جن مفسرین نے 'خاتم' میں زینت اور افضیلت کے معنی پیدا کیے ہیں، انھوں نے ایسا زبان کے کسی قاعدے یا استعمال کی بنا پر نہیں کیا، بلکہ شاید عقیدت میں کیا ہے۔ کیونکہ کلام عرب میں اس کا کوئی ثبوت ہمیں نہیں مل سکا۔

بہر حال، کلام عرب میں 'خاتم' کا لفظ مہر کے معنی میں مستعمل ہے اور آیت زیر بحث میں یہ مہر، یعنی مہر بند کے علاوہ کسی اور معنی کے لیے موزوں نہیں۔ اس کے لیے کلام عرب میں خاتم البرید ڈاکٹ کی مہر، خاتم الکتاب، کتاب پر مہر جیسی تراکیب مستعمل ہیں جو یہی مفہوم دیتی ہیں کہ مہر لگنے کے بعد اس میں مزید کسی چیز کے دخول کی گنجایش نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں لفظ 'خَاتَم' میں زینت، افضلیت اور کمال درجہ کے اختتام کے معانی نہیں پائے جاتے۔ اس کا ایک ہی مفہوم متعین ثابت ہوتا ہے اور وہ ہے مہر، یعنی حقیقی اختتام۔

لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث، خاتمیت نبوت کے مفہوم میں قطعی اور محکم آیت ہے۔ چنانچہ، خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف منصب نبوت ختم کر دیا گیا ہے، بلکہ حقیقت نبوت بھی ختم کر دی گئی ہے۔ یعنی آسمانی خبر جسے عربی میں 'نبأ' کہتے ہیں جس پر بھی آئے، وہ اصطلاحی یا لفظی اعتبار سے نبی کہا جا سکتا ہے۔ 'النَّبِيّٖنَ' کے لفظ میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ 'خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ' سے ہر قسم کے نبی کا اختتام واضح ہو رہا ہے۔ 'النَّبِيّٖنَ' کہہ کر ایسے تمام مناصب کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسی مضمر حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد میں واضح فرمایا:

لم يبق من النبوة إلا المبشرات. قالوا: وما المبشرات؟ قال: الرؤيا الصالحة. (بخاری، رقم ۶۹۹۰)	''نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی، صرف بشارت دینے والی باتیں رہ گئی ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں؟ فرمایا: اچھا خواب۔''

یہ خواب کسی کو نبی نہیں بنا سکتے، ان کی حد بتا دی گئی ہے، اور نہ کسی کو کسی نئے نبی کی نبوت پر ایمان لانے کی ترغیب دے سکتے ہیں، کیونکہ وہ حقیقت ہی میں موجود نہیں۔ رحمانی خواب اور شیطانی یا نفسانی خواب میں بھی حد امتیاز اور فیصلہ کن اتھارٹی خدا کا کلام کرتا ہے۔ جو خواب وحی کی تصریحات کے خلاف ہو، وہ سچا ہے نہ خدا کی طرف سے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید نبوت کے تسلسل کے بیان سے یکسر خالی ہے۔ اس سے بدیہی طور پر طے ہو جاتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ اور کوئی نبی آنے والا نہیں، اگر یہ فہم غلط ہوتا تو قرآن مجید اس کو لازمی طور پر مخاطب کرتا، اور نئے انبیا کی آمد مع ان کی نشانیوں کے ذکر کرتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کا بھی امکان قرآن مجید کی روشنی میں موجود نہیں۔ اس بنا پر بھی کوئی دعویٰ نبوت لائق اعتنا نہیں۔ ختم نبوت کی آیت اس پر مستزاد ہے جس نے تسلسل نبوت کے کسی بھی امکان پر مہر لگا دی ہے۔ کوئی خواب، الہام اور مکاشفہ اس معاملے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ دین کی تکمیل، اور اس کے ماخذوں، قرآن اور سنت متواترہ کے محفوظ ہو جانے اور رشد و ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد انسانوں کی آزمایش کا آخری دور شروع کیا گیا ہے۔ یہ عقل و فہم اور دلیل کا دور ہے۔ قرآن نے ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد عقل کے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے، نہ کہ پھر کسی خدائی مداخلت کے انتظار کی۔ اس سب کے لیے خدا کی اسکیم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اصلاح و دعوت

محمد ذکوان ندوی

تذکیر بالقرآن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استاذ جاوید احمد غامدی کا ایک سوال و جواب سننے کو ملا۔ اِس میں استاذ سے ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ آپ کی تقریر وتحریر سے تذکیر اور روحانیت[1] کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ استاذ نے فرمایا کہ ایک مومن کے لیے تذکیر کا سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے ایک معلم کی حیثیت سے ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم لوگوں کو متوجہ کر کے اُنھیں اللہ کی کتاب ـــــ قرآن ـــــ سے وابستہ کر دیں۔ یہ ہرگز ہمارا کام نہیں کہ ہم کسی شخص کے اندر وہ چیز پیدا کریں، جس کو 'روحانیت' کہا جاتا ہے۔ یہ صرف خدا کا کام ہے کہ وہ اپنی کتاب کے ذریعے سے کسی شخص کے اندر ایمان و معرفت کا نور پیدا کرے (المائدہ ۵: ۱۶)۔

قرآن ایک سچے مومن کے لیے زمین پر ایک خدائی دسترخوان کی حیثیت رکھتا ہے: 'القرآن مأدبة اللّٰہ'[2]۔ ایسی حالت میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کو معرفت یا 'روحانیت' کا ماخذ سمجھنا صرف اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہم قرآن اور صاحب قرآن، دونوں سے بے خبر ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے پیاس میں مبتلا ایک شخص چشمۂ آب کے بجائے سراب کو دریا سمجھ کر اُس سے اپنی پیاس بجھانا چاہے (النور ۲۴: ۳۹)۔

۱۔ واضح ہو کہ ''روحانیت'' کا لفظ قرآن وسنت میں اجنبی ہے۔

۲۔ المعجم الکبیر، الطبرانی، رقم ۸۶۴۶۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اِس قسم کا سوال کرنے والے کسی شخص نے اپنی زندگی میں کبھی ایک بار بھی 'ہدایت اور معرفت' کے مقصد سے قرآن مجید کا مطالعہ نہیں کیا۔ البتہ جن سعید روحوں کو اِس کی توفیق ملی، خدا نے بلاشبہ، اُنھیں تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا فرمائی۔ اِس کے برعکس، غیر قرآن سے ہدایت چاہنے والے تمام لوگوں کے لیے یہ مقدر کر دیا گیا کہ اُن کے اوپر کبھی اُس عظیم نعمت کا فیضان نہ ہو جس کو خدا کی سچی معرفت اور صراط مستقیم کی ہدایت کہا گیا ہے۔ اِس معاملے میں خدا کی ثابت شدہ سنت یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے سوا کہیں اور سے ہدایت پانا چاہے، خدا اُس کو ہدایت سے محروم کر دے گا: 'من ابتغى الهدى من غيره، أضلّه الله' (ترمذی، رقم ۲۹۰۶)۔

تذکیر و معرفت کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ کی کتاب ـــــ قرآن مجید ـــــ ہے۔ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'إنّكم لا ترجعون إلى الله عزّ و جلّ بشيء أفضل ممّا خرج منه، يعني القرآن'[۳]، یعنی تم اللہ کی طرف رجوع اور اُس کا تقرب اُس سے بہتر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جس کا ظہور خود اُس کی ذات سے ہوا ہے، یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید۔

قرآن مجید دعوت و معرفت، دونوں کا اولین ماخذ ہے۔ 'هُدًى لِّلنَّاسِ' (البقرہ ۲: ۱۸۵)، 'وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيْرًا' (الفرقان ۲۵: ۵۲) اور 'لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا' (الفرقان ۲۵: ۱) جیسی آیات میں اِسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں خود پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوے ارشاد ہوا ہے: 'فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ' (ق ۵۰: ۴۵)، یعنی اے پیغمبر، تم قرآن کے ذریعے سے لوگوں کی یاد دہانی کا کام کرو۔ پیغمبر اِسی کے ذریعے سے دعوت و اِنذار کا کام کرتا ہے، اور اب قیامت تک اُس کے تمام متبعین کو اِسی کے ذریعے سے دعوت و اِنذار کا کام کرنا ہے (الانعام ۶: ۱۹)۔

قرآن اسلامی زندگی کا ایک مکمل ہدایت نامہ ہے۔ ایمان کے بعد دینی اعتبار سے کسی آدمی کے لیے سیکھنے کی سب سے بڑی چیز اللہ کی کتاب ـــــ قرآن مجید ـــــ ہے۔ یہی اصحاب رسول کا طریقہ تھا۔ چنانچہ ایک صحابی (جندب بن عبداللہ) کہتے ہیں: 'كنا مع النبي صلى الله عليه و سلم فتيانًا حزاورة، فتعلّمنا الإيمان قبل أن نتعلّم القرآن، ثمّ تعلّمنا القرآن فنزداد به إيمانًا' (المعجم الکبیر، الطبرانی، رقم ۱۶۷۸)، یعنی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہ ہمارا عہد جوانی تھا۔ ہم نے اُس وقت پہلے ایمان حاصل کیا۔ اِس کے بعد جب ہم نے قرآن سیکھا تو وہ ہمارے لیے ازدیادِ ایمان کا ذریعہ بن گیا۔

اِس روایت کو اُس کے درست سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو اِس کو لے کر اٹھنے والے بعض فکری مباحث کے

۳۔ السلسلة الصحيحة، الألباني: ۹۶۱۔

لیے یہاں کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اصحاب رسول کے سامنے جس ذات نے ایمان کی دعوت پیش کی، وہ کوئی عام داعی نہیں، بلکہ خود اللہ کا پیغمبر تھا۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے جو چیز مطلوب تھی، وہ آپ پر ایمان تھا۔ اِس ایمان کے بغیر قرآن کی تعلیم وتصدیق ایک بے معنی بات تھی۔ چنانچہ اصحاب رسول نے پہلے ایمان کا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے آپ کو خدا کا پیغمبر مان کر اُس کی تصدیق کی۔ اِس ایمان واعتراف کے بعد پیغمبر نے اُن کو قرآن کی تعلیم دی۔ قرآن کی یہ تعلیم اُن کے لیے ازدیادِ ایمان کا ایک مسلسل ذریعہ بن گئی۔ اصحاب رسول کی طرح بعد کے اہل ایمان کو بھی اِسی روش کا ثبوت دینا ہے۔ اِس کے بغیر اُن کا ایمان 'مثل صحابہ ایمان' (البقرہ ۲: ۱۳۷) نہیں بن سکتا۔

قرآن بندوں پر خدا کی سب سے بڑی رحمت کا ظہور ہے (الرحمٰن ۵۵: ۱-۲)۔ خدا کی اِس رحمت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کے فکروعمل کے لیے اپنی کتاب کو آسان بنادے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے: 'وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ' (القمر ۵۴: ۱۷)، یعنی ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنادیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟

یہاں 'يَسَّرۡنَا' کا لفظ آیا ہے۔ عربی مبین میں اِس کے معنی محض آسان بنانے کے نہیں، بلکہ کسی چیز کو پیش نظر مقصد کی نسبت سے موزوں اور تمام متعلق چیزوں سے اِس طرح آراستہ کردینے کے ہیں کہ پورے معنوں میں اُس سے مطلوب مقصد حاصل کیا جاسکے۔ اِسی طرح، لفظ 'ذِکۡر' بھی یہاں اپنے وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی تعلیم، تذکیر، تنبیہ، عبرت اور یاددہانی، سب اِس کے مفہوم میں شامل ہے۔ ایسی حالت میں یہ بات پوری طرح مبرہن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید تذکیر ومعرفت کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن کے سوا اگر کسی چیز کو تذکیر ومعرفت کا ماخذ بنایا گیا تو نہ صرف یہ کہ آدمی معرفت سے محروم رہے گا، بلکہ تجربات بتاتے ہیں کہ بہت جلد اُس کی حد آجائے گی اور پھر آدمی کا سفر معرفت رک جائے گا۔ حدیث کے مطابق، خدا کی اِس دنیا میں یہ مقام صرف قرآن کو حاصل ہے کہ اُس کے ایک طالب علم کے لیے کبھی اُس کے 'عجائب' ختم نہ ہوں: 'لا تنقضي عجائبه'۔[۴] تلاوت وتدبر کے ذریعے سے مسلسل طور پر وہ قرآن سے ہدایت اور معرفت کی غذا حاصل کرتا رہے۔

[۵ دسمبر ۲۰۱۷ء، لکھنؤ]

---

[۴] الدارمی، رقم ۳۳۴۱۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

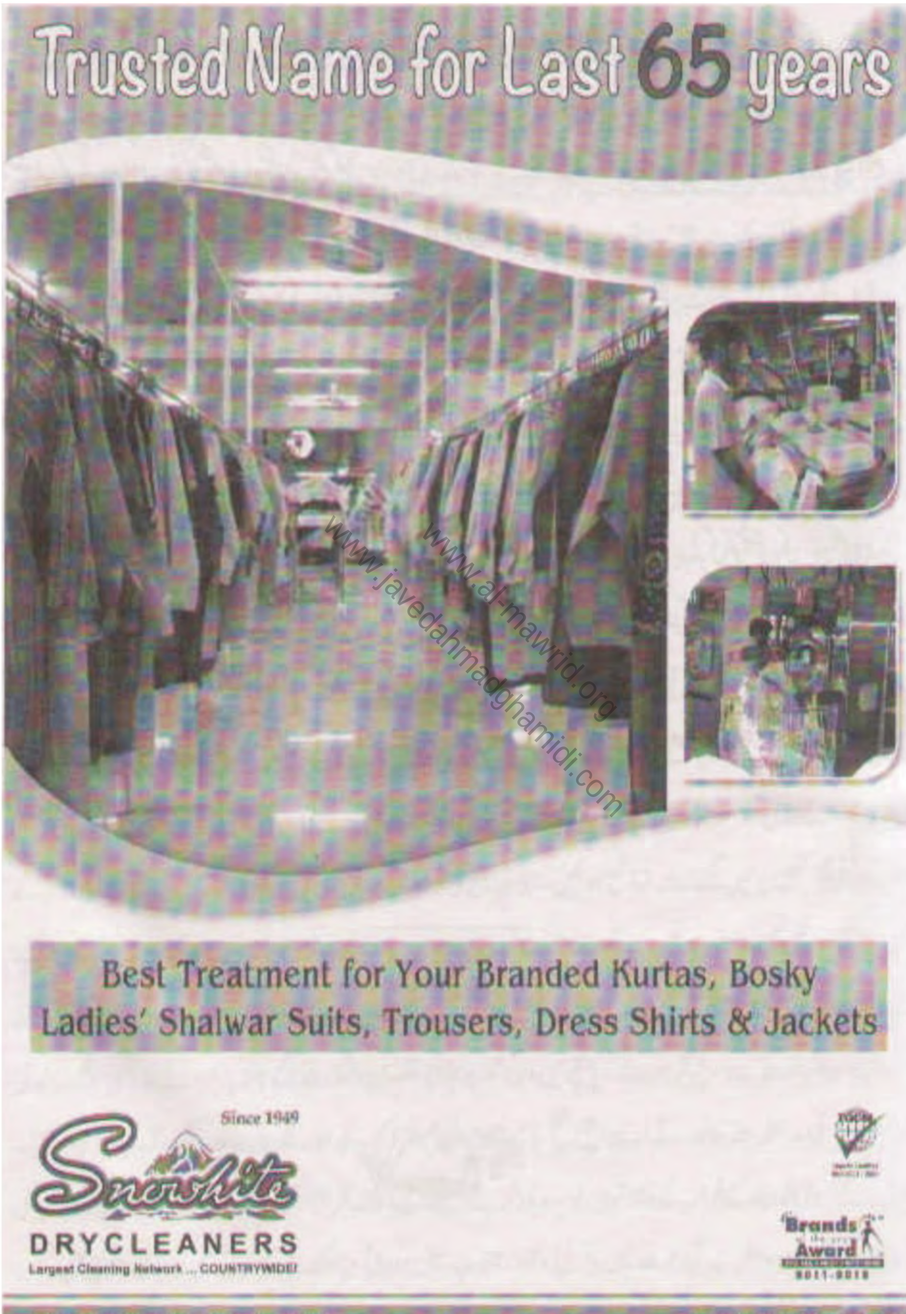

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Monthly
ISHRAQ
Lahore

Aug 2018
Vol.30 No.8
Regd. No. CPL- 183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore